جلد ۷۶ ستمبر ۱۹۷۱ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

۵ - الف ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

معیاری کتب

اسلام کے سیاسی نظام اور دوسرے نظاموں کے تقابلی مطالعہ کے لیے

		ستا	اعلیٰ
۱۔ اسلامی ریاست	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۰۰--۱۰ روپے	۰۰--۱۵ روپے
۲۔ خلافت و ملوکیت	″	۵-۵۰ ″	۱۰-۰۰ ″
۳۔ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان	″	۷-۷۵ ″	۱۳-۲۵ ″
۴۔ مسئلۂ قومیت	″	۲-۲۵ ″	۳-۵۰ ″
۵۔ الجہاد فی الاسلام	″	۱۰-۰۰ ″	۱۶-۰۰ ″
۶۔ اسلامی دستور کی تدوین	″	۰۰-۸۰	
۷۔ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی تدابیر	″	۰۰-۸۰	
۸۔ اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق		۰۰-۵۰	
۹۔ تنقیحات	″	۳-۲۵ ″	۹-۰۰ ″
۱۰۔ تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	″	۲-۲۵ ″	۴-۰۰ ″
۱۱۔ جہادِ اسلامی	خلیل احمد حامدی	۲-۷۵ ″	۵-۵۰ ″
۱۲۔ نظامِ اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں	″		۶-۵۰ ″
۱۳۔ عالمِ اسلام اور اس کے افکار و مسائل	″	۵-۰۰ ″	۷-۰۰ ″
۱۴۔ سُرخ اندھیروں میں	″	۱-۷۵ ″	۲-۷۵ ″

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکٹ لاہور (مغربی پاکستان) فون ۶۸۳۴۱

شاخ: ۱۶۔بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) فون ۲۸۳۸۷۹

ترجمان القرآن ، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۶ | ستمبر ۱۹۷۱ء مطابق رجب ۱۳۹۱ھ | عدد ۱

مغربی پاکستان — مشرقی پاکستان

چندہ سالانہ: آٹھ روپے — ماہنامہ ترجمان القرآن — سالانہ (ہوائی ڈاک) ۱۰ روپے

فی پرچہ : ۸۰ پیسے — ۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور — فی پرچہ (" ") ۹۰ پیسے

(عام ڈاک) : ۸۰ پیسے سالانہ ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

حال ہی میں پاکستان میں ایک کتابچہ سوویٹ یونین اور اسلام بزبان انگریزی وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا ہے۔ کتابچے کے لکھنے والے کمیونسٹ پارٹی ازبکستان کی مرکزی کمیٹی کے سابق سکرٹری مسٹر آر این نشانوو (R.N. NISHANOV) ہیں جو اب سیلون میں روس کی طرف سے بطور سفیر تعینات ہیں۔ صاحب موصوف چونکہ ایک طویل عرصہ تک ازبکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی ایک کلیدی اسامی پر فائز رہے ہیں اس لیے انہیں اس خطے کے مسلمانوں کے رجحانات اور اُن کے بچے کھچے مذہبی جذبات و احساسات سے گہری واقفیت نظر آتی ہے۔ پھر چونکہ وہ اپنے آپ کو کمیونزم کا سچا اور مخلص علمبردار ثابت کرنے کیلیے بھی شدید خواہشمند نظر آتے ہیں اس لیے روس کی مسلم ریاستوں میں "اسلامیت" کا کوئی نشان پاکر انہیں دلی قلق محسوس ہوتا ہے اور وہ اسے اشتراکیت کے لیے عظیم خطرہ تصور کرتے ہوئے مسلم معاشرے میں اسلام کے ایک۔ ایک نشان کو مٹانے اور مسلمانوں کو سو فیصد کمیونزم کا پرستار بنانے کے لیے وہ بعض بڑی مؤثر تجاویز پیش کرتے ہیں۔

مسٹر نشانو دنے روسی مسلمانوں اور اس ضمن میں پوری دنیائے اسلام کے حالات کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اُس سے اُن کے مشاہدے کی گہرائی اور مطالعے کی وسعت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ پھر چونکہ وہ اس وقت سیلون میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں اس لیے انہیں بھارت اور پاکستان کے مسائل سے گہری دلچسپی نظر آتی ہے اور وہ ایک کمیونسٹ کے نقطۂ نظر سے ان پر غور کرتے ہیں۔ اس کتابچے کو انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام معاذاللہ ایک بوسیدہ مذہب اور قرآن مجید ایک ایسی بوسیدہ کتاب ہے جس سے معاشرے کے کمزور طبقوں کا

استحصال کرنے والوں کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اسلام چند غیر عقلی توہمات سے عبارت ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو دانش کو اپیل کرے۔ اس مذہب نے ہمیشہ کمزور طبقوں کو دبانے اور برباد کرنے میں طاقتور طبقوں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کے طور پر کام دیا ہے۔ جنت و دوزخ، حشر و نشر سب اعتباری باتیں ہیں جن کا مقصد سادہ لوح عوام کو محض فریب دینا ہے۔

سب سے پہلے اسلام کی تعریف سنیئے۔

"اسلام دنیا کا غیر علمی رجعت پسندانہ تصور ہے جو مارکس لینن کے علمی تصور سے متصادم ہے۔ اسلام دانشترا کیت) کی رجائیت پسندانہ اور حیات آفریں مادی تعلیمات کے بالکل مخالف ہے اور سوویٹ یونین کے باشندوں کے مفادات سے مغائرت رکھتا ہے۔ یہ مسلمانوں کو اشتراکی معاشرہ کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرنے میں مزاحم ہوتا ہے۔

قرآن مجید خلیفہ کے ہمنوا جاگیرداروں اور بڑے بڑے تاجروں کو خوش کرنے کے لیے تصنیف کیا گیا، اس میں جنت و دوزخ کے جو قصے درج ہیں ان کا مقصد مزدوروں کو بے بس غلاموں میں تبدیل کرنا ہے۔ مسلمانوں کے مقدس تہوار خصوصاً عید الاضحیٰ اور صیام رمضان اُس دور کے باقیات ہیں جب انسان اس امر کا یقین رکھتا تھا کہ وہ جادو کے ذریعے دیوتاؤں اور بدروحوں کو خوش کر سکتا ہے۔ حج عرب کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی آمدنی کا ایک ذریعہ ہے اور اب استعمار پسند حج کے موسم کو جاسوسوں اور انتشار پسندوں کی بھرتی کرنے کیلیے ایک اچھا موقع تصور کرتے ہوتے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیمات دنیا کی ساخت اور اس کے وجود کے بارے میں قدرت کی کرشمہ سازیوں کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات پیش کرتی ہیں ..... قرآن قوانین فطرت اور قوانین معاشرت کی نفی کرتا ہے اور ان کی جگہ اس اصول کا پرچار کرتا ہے، "خدا اپنی منشاء کے مطابق کائنات کو پیدا کرتا اور اپنی خواہش کے مطابق اسے چلاتا ہے۔

(اس طرزِ فکر سے، یہ حقیقت خود بخود منکشف ہوجاتی ہے کہ قرآن کے مصنفین اس چیز سے بے خبر تھے کہ مظاہرِ قدرت کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اسلامی اوّیۂ نگاہ سے جسے خدا کی مرضی کہا جاتا ہے وہ فطری ربط و ضبط ہے ..... جس وقت

قرآن تصنیف کیا جا رہا تھا، نہ صرف اس کے مصنفین بلکہ اس کے مخاطب بھی مظاہرِ قدرت کے بارے میں بہت کم واقفیت رکھتے تھے اور جو چیز اُن کی سمجھ میں نہ آتی تھی اس کے متعلق یہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اینجل نے کہا ہے: اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں ناقابلِ ادراک مظاہرِ قدرت کو حادثہ کا نام دوں یا خدا کا۔ یہ دونوں نام میری کم علمی کے مظہر ہیں اور ان کا علم سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ جہاں (علت و معلول) کی کڑیاں مفقود ہوں وہاں علم کے وجود کا کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے۔" (ص ۹-۱۱)

اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مُصنّف اسلام اور سائنس کے درمیان کسی سمجھوتے کو بالکل ناممکن سمجھتا ہے اور جو لوگ اس قسم کی کوششوں میں مصروف ہیں انہیں دیوانہ خیال کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک سائنس انسان کی شعوری قوتوں کو بیدار کرتی ہے جبکہ مذہب انسان کے ذہن کو تاریک بناتا اور اسے فطرت کی قوتوں کے سامنے بے بس ہو کر زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے اس سے اس کی تخلیقی جد و جہد میں کمی آتی ہے۔ ص ۱۱

پھر مُصنّف کو اسلام سے یہ بھی شکایت ہے کہ وہ مسلمانوں کو ماضی کی طرف رجوع کرنے کا درس دیتا ہے اور انہیں یہ بتاتا ہے کہ اُن کی تاریخ کا روشن دَور ماضی میں ہے اسی سلسلے میں وہ اُس گہوارۂ جنت کا بھی مذاق اڑاتا ہے جس میں سب سے پہلے حضرت آدمؑ اور حوا کو رکھا گیا یعنی تخلیقِ انسان کے اس سب سے اہم واقعہ کو ایک لغو قصّے سے تعبیر کرتا ہے۔ مسٹر نشانووکے الفاظ میں مسلمانوں کی اس ماضی پرستی کے نقصانات یہ ہیں:

"اسلام کے "سنہری زمانہ" کے تصور نے کرۂ ارضی پر تنظیمِ نو کے لیے جد و جہد کو کافی صدمہ پہنچایا ہے۔ یہ تو درحقیقت غلامی، بے بسی اور انسانی محنت کی فتح و کامرانی میں بے یقینی کا ایک وعظ ہے۔" ص ۱۲

قرآنِ حکیم اور اُس کی تعلیمات سے سرسری واقفیت رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ اس

کتاب الٰہی نے انسانی عزّوشرف کا جس قدر پرچار کیا ہے وہ دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا۔ اس نے انسان کو اُس کے بلند مرتبہ سے آگاہ کیا اور اُسے بتایا کہ وہ اس زمین پر خدا کا نائب ہے اور ساری کائنات اُسی کی خدمت اور چاکری کے لیے پیدا کی گئی ہے مگر یہ عجیب المیہ ہے کہ کتابچہ کے فاضل مصنّف کو قرآن مجید میں انسان کی تذلیل کے سوا کوئی دوسری چیز نظر نہیں آئی۔

"قرآن انسان کے عزّوشرف، اُس کے ذہن، اس کی عظمت اور اُس کی تخلیقی قوتوں کے بے پایاں ممکنات کو کم کرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے انسان خواہ کتنی ہی محنت کرے وہ کوئی اچھی چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ قرآن دنیوی زندگی اور انسان کے معاملات کو محض طفل تسلی اور جھوٹی شان و شوکت سے تعبیر کرتا ہے۔"

اِس تمہید کے بعد مصنف قرآن مجید سے اُن آیات کو نقل کرتا ہے جن میں آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی چند روزہ زندگی کی بے وقعتی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ان آیات سے بالکل غلط نتائج اخذ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگر ہم قرآن پر اعتماد کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اصل غرض اجتماعی اعتبار سے مفید محنت کرنا یا مختلف ممالک کے عوام کے دوش بدوش کھڑے ہو کر بہتر اور شادکام زندگی کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا نہیں جس سے قومی اور معاشرتی استبداد کا خاتمہ ہو بلکہ قرآن کی تعلیمات کی رُو سے انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ مصائب یعنی استحصال کرنے والوں کے ظلم و ستم کو برداشت کرے ——— اور قرآن اُن کی توجہ معدوم جنت میں اخروی فلاح کی طرف مبذول کراتا ہے۔ یہ سماج دشمن اور عوام دشمن سرگرمیاں ہیں۔ ان کا مقصد مزدوروں کو معاشرہ کی تنظیم نو کے لیے طبقاتی جدوجہد سے الگ رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت پسندانہ حکومتیں اسلام کی حمایت پر کمربستہ ہوتی ہیں۔

اسلام ایک طبقاتی معاشرے کا مذہب ہے اس میں جنت کا عقیدہ استحصال کرنے والوں کے حقوق کی پاسبانی کرتا ہے۔ قرآن مومنوں کو جنت میں ٹھنڈک آسودگی اور سیاہ پلکوں والی حوروں کی بشارت دیتا اور اسے فوزِ عظیم قرار دیتا ہے۔ حیات

بعد مماثت کی جس قدر تعلیمات ہمیں قرآن میں ملتی ہیں اور مسلمانوں کو جنت میں نوازشات کے جس قدر وعدے کیے گئے ہیں یہ سب ایک ایسے سماج کے تصورات ہیں جس میں استحصال کا دور دورہ ہو۔ قرآن اس استحصال کو قدرتی امر خیال کرتا ہے اور اس بات کا دعویدار ہے کہ انسانی طبقاتی استبداد، غلامی کو خود خدا نے قائم کیا ہے۔" ص ۱۵

مصنف سورۃ الزخرف کی آیت ۳۲ کا غلط ترجمہ درج کر کے اپنی طرف سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

"قرآن کی رُو سے اسلام ایک ایسے مذہب کی نمائندگی کرتا ہے جو استحصال کرنے والوں کا مؤید ہے۔ ذاتی ملکیت اور معاشی ناانصافی کو قرآن تحفظ دیتا اور ان دونوں کو وہ رحمتِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔ . . . قرآن غریبوں اور بیکسوں کو اس بات سے ڈراتا ہے کہ امراء کی جائداد کے خلاف کوئی کوشش کر کے اپنے مصائب کو بدلنے کی جدوجہد کریں . . . . اس طرح غربت و افلاس، شدید انسانی مصائب، معاشرتی ناانصافی اور غلامی قرآن حکیم کی رُو سے خدا کی نظر میں پسندیدہ اعمال ہیں۔" ص ۱۵-۱۶

مسٹر تسانود کو اس بات سے بھی سخت کرب و اضطراب محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے عقیدہ کی بنیاد پر انسانیت کی شیرازہ بندی کی ہے۔ اُس نے نوعِ بشری کو امیر اور غریب کے درمیان تقسیم کرنے کے بجائے کفر و اسلام کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے۔ اسلام کے ماننے والے خواہ کسی ملک، کسی نسل اور کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، ایک برادری کے افراد ہیں جسے قرآن حکیم نے امتِ وسط کہا ہے اور خدا اور رسول کا انکار کرنے والے خواہ وہ کسی رنگ اور نسل کے ہوں اسلامی نقطۂ نظر سے ایک قوم ہیں

چشمِ فلک نے آج تک انسانیت کی شیرازہ بندی کی اس سے بہتر کوئی دوسری بنیاد نہیں دیکھی کہ نیکی، پاکبازی، خدا خوفی ایک طرف ہو اور کفر و ضلالت اور شر و فساد دوسری طرف ہو۔ اس ایک بنیاد کے علاوہ ہر دوسری بنیاد باطل ہے۔

اشتراکیت کی نظر میں یہی بنیاد سب سے زیادہ غلط اور قابلِ نفرت ہے۔ وہ انسانیت کو غربت اور امارت کی بنیاد پر دو گروہوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہے مسٹر تسانود نے مختلف مقامات پر اس بات کا رونا رویا ہے کہ مسلمان قومیت کے اس آفاقی تصور سے ابھی تک ناآشنا نہیں ہوئے، اُن کے تحت الشعور میں

عقیدے کی بنیاد پر ملت کی شیرازہ بندی کا تخیل آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ مسٹر لشانوو کے الفاظ میں اس تخیل سے استحصال پسندوں نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ پاکستان کے وجود کو بھی مصنف اسی رجعت پسندانہ تصور کا ایک مظہر خیال کرتا ہے۔

> "اسلام نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کے مابین نفرت کے جو بیج بوئے ہیں اُسے استحصال کرنے والوں نے مشرق میں قومی آزادی کی تحریکوں کو کمزور کرنے کے لیے خوب استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۷ء میں برطانوی استعمار پسندوں نے مذہب کی اساس پر بھارت اور پاکستان کی تقسیم کر دی" ص ۱۸-۹

مسٹر لشانوو اس بات سے بھی سخت برہم ہیں کہ قرآن مسلمانوں کو آپس میں اخوت اور بھائی چارہ قائم کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس طرح انہیں طبقاتی کشمکش سے الگ کر کے غریبوں کے حقوق پامال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے قرآن مجید کی آیات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی اس شرمناک انداز میں تحریف کی ہے کہ انسان حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا کوئی علم کا دعویدار پستی کی اس سطح تک بھی جا سکتا ہے۔ ہم یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور فرمان ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس فرمان کے ساتھ احادیث میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ اس پر حضور کے جاں نثاروں نے آپ سے یہ بھی دریافت فرمایا کہ حضور مظلوم کی مدد کا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر ظالم کی امداد سمجھ میں نہیں آتی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ اُسے ظلم کرنے سے باز رکھو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اور یہ تصریح احادیث کے قریب قریب سارے مجموعوں میں موجود ہے مگر لشانوو کی بددیانتی ملاحظہ ہو کہ اُس نے حدیث کے صرف پہلے ٹکڑے کو درج کیا ہے، یعنی مدد کرو اپنے مسلمان بھائی کی خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم" دوسرے حصے کے متعلق وہ یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ الفاظ تصنیف کیے انہیں خود بھی ان کے سماج دشمن ہونے کا احساس ہوا اور انہوں نے بعد کے الفاظ شامل کر لیے مگر ان کا مدعا اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کو طبقاتی کشمکش، جو معاشرتی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لیے برپا کی جاتی ہے، باز رکھا جائے اور اس طرح انہیں استحصال پسندوں، نوآبادکاروں کے سامنے سرنگوں رہنے کی تعلیم دی جائے اور انہیں ہمیشہ غلامی، افلاس اور بھوک کو برداشت کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

مسٹر لشانوو نے اس بات پر ماتم کیا ہے کہ مسلمان عہد جدید میں قومیت کے اس تصور کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے

کی کوشش کر رہے ہیں اور مارکس کے کیپٹل کے بجائے قرآن مجید کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں مصنف اُن لوگوں کی کوششوں کو بھی بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اسلام اور اشتراکیت کے درمیان پیوند کاری میں مصروف ہیں یا اسلامی تعلیمات کو اشتراکی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ وہ اس قسم کی کوششوں کو بالکل لغو قرار دیتا ہے کیونکہ اسلام اور اشتراکیت کے مابین کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے قدرِ مشترک کہا جا سکے، اس لیے جو لوگ ان کے درمیان ملاپ کرانے کے آرزومند ہیں وہ مسٹر لشانوو کی نظر میں اشتراکیت کی راہ کھوٹی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو:

> "قرآن کے اخلاقی اور قانونی ضابطے اور اس کا نظامِ شریعت جس طرح کہ اس نے طبقاتی معاشرہ میں نشوونما پائی ہے، استحصال پسندوں کے مفادات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس نظام کا حقیقی انسانیت پرستی سے کوئی دُور کا تعلق نہیں۔ وہ انسانیت پرستی جو کہ اشتراکیت کے معماروں کے ہاں ملتی ہے جو ایسے اخلاقی اصولوں سے عبارت ہے جن کی بنا پر عوام کے تعلقات باہمی عزت و احترام پر استوار ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے سوویٹ یونین کے عوام کے مابین دوستی اور اخوت کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔" ص ۲۴-۲۵

مصنف کو اس بات سے تو کسی قدر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ سوویٹ یونین کا مسلمان اپنی مذہبی روایات کو خیرباد کہہ رہا ہے مگر اُسے یہ دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے کہ وہ پورے طور پر اشتراکی بننے میں متامل نظر آتے ہیں۔ ان مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا حصّہ اس بات کا متمنی ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے۔ اس لیے وہ مختلف تاویلات کے ذریعے اسلام اور اشتراکیت کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم عنان رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ مصنف اس نعرے "کلّ مسلمٍ اخوۃ" میں ایک عظیم خطرہ محسوس کرتا ہے اور مسلمانوں کے اندر اس نعرے کو رواج دینے کا حامی ہے: "مسلمان ایک دوسرے کے کامریڈ ہیں۔" اس کا خیال یہ ہے کہ اخوت کے لفظ سے ذہن شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے تصورِ ملت کی طرف پلٹتا ہے اور کامریڈ کے لفظ کے استعمال سے مسلمانوں میں اشتراکی تصورِ قومیت

کو قوت فراہم ہوتی ہے۔ مسٹر نشانو و جہاں کہیں بھی اسلامی بیداری کا کوئی معمولی نشان بھی پاتے ہیں تو انہیں سخت اذیت پہنچتی ہے۔ مثال کے طور پر انہیں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوویٹ مسلمانوں کے اندر قرآن مجید کے پڑھنے کا رجحان پھر سے پیدا ہو رہا ہے یا وہ اپنی روح کی تسکین کے لیے از سرِ نو مذہبی رسُوم ادا کرنے لگے ہیں تو وہ چونک پڑتے ہیں اور اشتراکیت کے علمبرداروں کو کسی بہت بڑے خطرے کی دہائی دیتے ہیں۔ انہیں اسلام کے تصورِ خدا میں ایک آمر کی روح نظر آتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس تصور کے رواج پانے سے جاگیرداری اور سرمایہ داری کا زور بڑھے گا۔ انہیں اس بات سے بھی خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے میں ابھی علماء کا وقار باقی ہے۔ اور لوگ اپنی معاشرتی زندگی خصوصاً شادی بیاہ کے معاملات میں اُن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کو بیان کرنے کے بعد مسٹر نشانو و اپنی پُوری توجہ رُوسی مسلمانوں کی طرف منذول کرتا ہے۔ وہ اس بات کو پُوری طرح ذہن نشین رکھ کر اپنی بات آگے بڑھاتا ہے کہ صدیوں پُرانی روایات جو مسلم معاشرے میں اپنی جڑیں دُور دُور تک پھیلا چکی ہیں اور صدیوں پُرانے اعتقادات جو مسلمانوں کے قلب و دماغ میں اچھی طرح پیوست ہو چکے ہیں انہیں بیخ و بُن سے اکھاڑنا کوئی سہل اور آسان کام نہیں اس کے لیے بڑی حکمت و دانائی اور تدبر کی ضرورت ہے۔ اِس ضمن میں سوویٹ حکومت کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مسلمان ابھی تک اشتراکیت کے صحیح معنوں میں پرستار نہیں بن سکے۔ ان کے خیالات ان کی مذہبی رسومات، اُن کے معاشرتی اداروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ابھی تک دین کی کچھ دبی چنگاریاں موجود ہیں جو ذرا سی ہوا دینے سے فوراً بھڑک سکتی ہیں اس لیے سوویٹ حکومت کے یہ سچے خیر خواہ سب سے پہلے اُن اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے مذہب کی کچھ چنگاریاں باقی رہ گئی ہیں اور پھر اُن تدابیر کا ذکر کرتے ہیں جن سے انہیں بالکل راکھ بنایا جا سکتا ہے۔

مسٹر نشانو و سب سے پہلے زارِ روس کی کوتاہی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُس نے مسلم علاقوں کو روسی نوآبادیوں میں تبدیل کرنے میں بڑی ہمت کا ثبوت دیا مگر اُس نے حماقت یہ کی کہ اسلام سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ مسجد کی حمایت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "مُلّا" کو مسلم معاشرے میں کافی حد تک بالا دستی حاصل رہی اور اس طرح

کوئی ہمہ گیر انقلاب پوری کامیابی کے ساتھ برپا نہ کیا جا سکا۔

پھر اشتراکیت کے ان علمبرداروں سے دوسری فروگذاشت یہ ہوئی کہ وہ قومی رسومات اور روایات کو مذہبی اثرات سے دانشمندی کے ساتھ بچانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ مسلمانوں کے قومی تہواروں اور اداروں پر اسلام کی چھاپ کسی نہ کسی صورت میں باقی رہی۔ مسٹر نشانوو کے خیال کے مطابق مسلمانوں کو پوری طرح ملحد بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسے انتظامات کیے جاتے جن سے لوگ دینِ حق سے برگشتہ ہوتے اور دینِ اشتراکیت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرتے۔ اس ضمن میں جتنی تدابیر بھی کی گئیں ان میں سے بعض انہیں بُری پسند ہیں، مثلاً اپریل ۱۹۲۳ء کے ماہِ صیام میں ایک ایسا پروگرام ترتیب دیا گیا جس سے عوام کے ذہنوں میں اس مقدس مہینے کی عظمت ختم ہو اور مسلمان اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے اور تزکیۂ نفس کی تربیت حاصل کرنے کے بجائے خدا کے باغی اور نفس کے بندے بن سکیں۔ اس پروگرام کی تفصیل ذرا مصنف کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں:

> "اپریل ۱۹۲۳ء میں شہری اور علاقائی پارٹی کی کمیٹیوں نے پارٹی کی ساری ابتدائی تنظیموں کو مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کے لیے پوری طرح استعمال کیا، خصوصاً ماہِ رمضان میں ان سے خوب کام لیا گیا۔ اس ماہ کے آغاز سے پہلے غریب کسانوں کے اشتراک سے نہایت خوبصورت قہوہ خانے قائم کیے گئے۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس مہینے میں لوگ قہوہ خانوں میں جاتے، وہاں مختلف قسم کی مجالس منعقد ہوتیں جن میں اہم سیاسی اور معاشی اور مقامی معاملات زیرِ بحث آتے۔ ان مجالس میں تجربہ کار انقلابی نہایت دلچسپ انداز میں سامعین سے خطاب کرتے۔

مسٹر نشانوو کے خیال کے مطابق چونکہ مسلمانوں کو پوری طرح اشتراکی بنانے میں کئی قسم کی کوتاہیاں ہوئی ہیں اس لیے وہ سو فیصد ملحد اور زندیق نہیں بنے۔ اُن کے معاشرے میں ابھی تک کچھ علامات ایسی موجود ہیں جن سے رجعت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ مصنف کو سب سے بڑا دکھ اس بات کا ہے کہ ابھی تک "ملا" پوری طرح درست نہیں ہوا اور وہ حکومت کی شدید مذہب دشمن پالیسی کے باوجود ان علامات" کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں ذرا ان کے اضطراب کا اندازہ لگائیں:

"بعض مسلمان علاقوں میں ایک شخص اکثر اوقات شادی بیاہ، بچے کی پیدائش اور موت پر مذہبی رسومات کو دیکھتا ہے" ص ۲۳

پھر مصنف کو سب سے زیادہ کوفت اس بات سے ہوتی ہے کہ ان مذہبی روایات کو صرف جاہل عوام ہی سینے سے نہیں لگا رہے بلکہ بعض اوقات بڑے اونچے اور پڑھے لکھے مسلمان بھی انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصنف کے ارشاد کے مطابق:

"بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ ان مذہبی رسومات کو علمی پیشہ سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم آبادی کے ایک علاقے میں جسے اندیزہان کہا جاتا ہے ۱۹۶۸ء میں جن مسلمانوں نے شریعت کے مطابق نکاح کیا ان میں ستر کی تعداد میں محکمۂ تعلیم سے تعلق رکھنے والے ۶۲ طلبا اور دس ڈاکٹر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ زبانی طور پر تو سائنٹفک فلسفہ کے حامی ہیں مگر عملی زندگی میں وہ مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اشتراکی نظام کو نقصان پہنچاتے ہیں اور ان کا طرزِ عمل عوام کے اذہان پر ضرر رساں اثرات مترتب کرتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جبکہ بعض اشتراکیوں نے اپنی انفرادی زندگی میں مذہب کے ساتھ ایک صلح پسندانہ روش اختیار کی۔ یعنی مذہبی رہنماؤں کے بتائے ہوئے غیر انسانی افعال کے ساتھ سمجھوتہ کیا اور بعض اوقات انہوں نے مذہبی رسوم بھی ادا کیں۔

اس قسم کی باتوں کا وجود ناقابلِ برداشت ہے چنانچہ ازبکستان کی اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایسے تمام لوگوں کو سخت سرزنش کی اور جماعت کی جملہ تنظیموں کو حکم دیا کہ وہ کمیونزم سے تعلق رکھنے والوں سے پارٹی کے اصولوں کی بلا چون و چرا پابندی کرنے کا مطالبہ کریں۔

اشتراکیت چونکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اس لیے اسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ مذہب کسی شکل میں بھی اشتراکی معاشرے میں باقی رہے۔ کمیونزم کے سچے خیر خواہوں کو وہ کوششیں بھی کھلتی ہیں جو اشتراکیت کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے بعض لوگوں نے وقتاً فوقتاً کی ہیں۔ مسٹر لشانود کو اس میں

یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کو اگر غیر عقلی عناصر سے پاک کر دیا گیا تو اس میں اپنے آپ کو علمی نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور یہ رجحان عوام کو پھر مذہب کا گرویدہ بنا دیگا۔ مسٹر نشانودکو اس بات سے بھی کد ہے کہ اسلام نے اخلاق کی جو آفاقی قدریں پیش کی ہیں یعنی امانت و دیانت، بزرگوں کا احترام، صبر و استقلال، چوری اور زنا سے پرہیز، اُن کا بھی پرچار کیا جائے کیونکہ اُس کے خیال کے مطابق ان قدروں کے زندہ رہنے سے مذہب کی زندگی میں اضافہ ہونے کا خطرہ ہے۔ مسٹر نشانودان قدروں کے حفظ و بقا کی کوششوں کو ملا کی اشتراکیت کے خلاف گہری سازش سے تعبیر کرتا ہے۔

اس کتابچے کے آخری حصّے میں مصنف نے مسلمانوں کو اشتراکیت کے رنگ میں پوری طرح رنگنے کے لیے بعض تجاویز بھی پیش کی ہیں جن کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

ان کی پہلی تجویز یہ ہے کہ اسلام کی براہِ راست مخالفت نہ کی جائے بلکہ ایسے افکار و نظریات کا پوری کوشش سے پرچار کیا جائے جن کے پھیلنے سے اسلامی تعلیمات بالکل تاریک خیالی بن کر رہ جائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور سائنس کے مابین جو عظیم فرق ہے اسے نوجوان نسلوں کے اچھی طرح ذہن نشین کرایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ سائنس کو مذہب سے وہی تعلق ہے جو روشنی کو تاریکی سے ہوتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو بیک وقت کسی طور بھی اپنایا نہیں جا سکتا۔ اگر انسان کو علم کی روشنی مقصود ہے تو پھر اسے مذہب کی جہالتوں سے اپنے آپ کو بچانا پڑے گا۔ چنانچہ جب بھی اشتراکیت کا پرچار اس سائنٹفک انداز میں کیا گیا تو اس سے بڑے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے مثلاً پہلی جنگِ عظیم سے پیشتر سوویٹ یونین میں ... ۲۵ مساجد تھیں مگر اب ان کی تعداد کم ہو کر صرف چند سو رہ گئی ہے اور ان میں بھی زیادہ تر عبادت کے لیے نہیں بلکہ دوسری تقریبات کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان مساجد کے بجائے اب وہاں ہزاروں یونیورسٹیاں اور مدارس قائم ہو چکے ہیں جو شب و روز ملحدانہ تعلیم دینے میں مصروف ہیں۔

مسٹر نشانودان نمایاں کامیابی پر خوش نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ کام زیادہ وسیع پیمانے پر اور زیادہ منظم طریق سے سرانجام دیا جائے کیونکہ مسلم آبادی کے ایک بہت بڑے حصّے نے اشتراکی فلسفہ کو دل و جان سے قبول نہیں کیا۔ اس لیے وہ اپنی نجی زندگی میں اس دین سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

تفہیم القرآن

البروج

نام | پہلی آیت کے لفظ البروج کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کا مضمون خود یہ بتا رہا ہے کہ یہ سورۃ مکۂ معظمہ کے اُس دَور میں نازل ہوئی ہے جب ظلم و ستم پُوری شدت کے ساتھ برپا تھا اور کفارِ مکہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع کفار کو اُس ظلم و ستم کے بُرے انجام سے خبردار کرنا ہے جو وہ ایمان لانے والوں پر توڑ رہے تھے، اور اہلِ ایمان کو یہ تسلی دینا ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ لے گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اصحابُ الاُخدود کا قصہ سنایا گیا ہے جنہوں نے ایمان لانے والوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک پھینک کر جلادیا تھا۔ اور اس قصے کے پیرائے میں چند باتیں مومنوں اور کافروں کے ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح اصحاب الاُخدود خدا کی لعنت اور اس کی مار کے مستحق ہوئے اُسی طرح سردارانِ مکہ بھی اُس کے مستحق بن رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان لانے والوں نے اُس وقت آگ کے گڑھوں میں گر کر جان دے دینا قبول کر لیا تھا اور ایمان سے پھرنا قبول نہیں کیا تھا۔ اُسی طرح اب بھی اہلِ ایمان کو چاہیے کہ ہر سخت سے سخت عذاب بھگت لیں مگر ایمان کی راہ سے نہ ہٹیں۔ تیسرے یہ کہ جس خدا کے ماننے پر کافر بگڑتے اور اہلِ ایمان اصرار کرتے ہیں وہ سب پر غالب ہے، زمین و آسمان کی سلطنت کا مالک ہے۔ اپنی ذات میں آپ حمد کا مستحق ہے۔ اور وہ دونوں گروہوں کے حال کو دیکھ رہا ہے، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ کافروں کو نہ صرف اُن کے کفر کی سزا جہنم کی صورت میں ملے، بلکہ اُس پر مزید اُن کے ظلم کی سزا بھی اُن کو آگ کے جلنے کے دینے کی شکل

میں بھگتنی پڑے ۔ اسی طرح یہ امر بھی یقینی ہے کہ ایمان لا کر نیک عمل کرنے والے جنت میں جائیں اور یہی بڑی کامیابی ہے ۔ پھر کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہے ، اگر تم اپنے جتھے کی طاقت کے زعم میں مبتلا ہو تو تم سے بڑے جتھے فرعون اور ثمود کے پاس تھے ، اُن کے لشکروں کا جو انجام ہوا ہے اس سے سبق حاصل کرو ۔ خدا کی قدرت تم پر اس طرح محیط ہے کہ اُس کے گھیرے سے تم نکل نہیں سکتے ، اور قرآن جس کی تکذیب پر تم تلے ہوئے ہو، اُس کی ہر بات اٹل ہے ، وہ اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کا لکھا کسی کے بدلے نہیں بدل سکتا ۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی [1]، اور اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے [2]، اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی [3] کہ مارے گئے گڑھے والے، (اُس گڑھے والے) جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی جبکہ وہ اس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اُسے دیکھ رہے تھے [4]۔ اور اُن اہلِ ایمان سے اُنکی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور

---

[1] اصل الفاظ ہیں ذَاتِ الْبُرُوجِ ، یعنی برجوں والے آسمان کی ۔ مفسرین میں سے بعض نے اس سے مراد قدیم علمِ ہیئت کے مطابق آسمان کے ۱۲ برج لیے ہیں ۔ اور ابن عباس ، مجاہد ، قتادہ ، حسن بصری ، ضحاک اور سدی کے نزدیک اس سے مراد آسمان کے عظیم الشان تارے اور سیارے ہیں ۔

[2] یعنی روزِ قیامت ۔

[3] دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی چیز کے بارے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں ، مگر ہمارے نزدیک سلسلۂ کلام سے جو چیز مناسبت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ دیکھنے والے سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قیامت کے روز حاضر ہوگا اور دیکھی جانے والی چیز سے مراد خود قیامت ہے جس کے ہولناک احوال کو سب دیکھنے والے دیکھیں گے ۔ یہ مجاہد ، عکرمہ ، ضحاک ، ابن نجیح اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے ۔

[4] گڑھے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ بھڑکا کر ایمان لانے والے لوگوں کو اُن میں پھینکا اور اپنی آنکھوں سے اُن کے جلنے کا تماشا دیکھا تھا ۔ مارے گئے کا مطلب یہ ہے کہ اُن پر

خدا کی لعنت پڑی اور وہ عذابِ الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ اور اِس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ایک برجوں والے آسمان کی۔ دوسرے، روزِ قیامت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ تیسرے، قیامت کے ہولناک مناظر کی اور اُس ساری مخلوق کی جو اُن مناظر کو دیکھے گی۔ پہلی چیز اِس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو قادرِ مطلق ہستی کائنات کے عظیم الشان ستاروں اور سیاروں پر حکمرانی کر رہی ہے اس کی گرفت سے یہ حقیر و ذلیل انسان کہاں بچ کر جا سکتے ہیں۔ دوسری چیز کی قسم اِس بنا پر کھائی گئی ہے کہ دنیا میں اُن لوگوں نے جو ظلم کرنا چاہا کر لیا، مگر وہ دن بہرحال آنے والا ہے جس سے انسانوں کو خبردار کیا جا چکا ہے کہ اُس میں ہر مظلوم کی داد رسی اور ہر ظالم کی پکڑ ہو گی۔ تیسری چیز کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ جس طرح ان ظالموں نے ان بے بس اہلِ ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھا اُسی طرح قیامت کے روز ساری خلق دیکھے گی کہ اِن کی خبر کس طرح لی جاتی ہے۔

گڑھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو اُن میں پھینکنے کے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں کئی مرتبہ اِس طرح کے مظالم کیے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک واقعہ حضرت صُہیبؓ رومی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اُس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آنے جانے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحبِ کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا، مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اُس پر کارگر نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا کہ اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمعِ عام میں باسمِ ربّ الغُلام (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کر مجھے تیر مار، مَیں مر جاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکار اُٹھے کہ ہم اِس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اُس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اِس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے ان میں آگ بھروائی، اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا اس کو آگ میں پھکوا دیا (احمد، مسلم، نسائی، ترمذی، ابن جریر، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، طبرانی، عبد بن حُمید)۔۔۔

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات اُستوار ہو گئے۔ بات کھلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اُس شخص کو پھکواتا چلا گیا جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اُسی وقت سے مجوسیوں میں محرمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے (ابن جریر)۔

تیسرا واقعہ ابن عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دین موسیٰ علیہ السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا یہاں تک کہ انہوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں اُن لوگوں کو پھینک دیا جو اس سے انکار کرتے تھے (ابن جریر، عبد بن حُمَید)۔

سب سے مشہور واقعہ نَجْران کا ہے جسے ابن ہشام، طَبَری، ابن خَلدون اور صاحب مُعجَم البُلدان وغیرہ اسلامی مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حِمْیَر (یمن) کا بادشاہ تُبّان اسعد ابو کَرِب ایک مرتبہ یثرب گیا جہاں یہودیوں سے متاثر ہو کر اس نے دینِ یہود قبول کر لیا اور بنی قُرَیظہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ پھر اس کا بیٹا ذُو نُواس اس کا جانشین ہوا اور اُس نے نَجْران پر، جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا، حملہ کیا تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ (ابن ہشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے اصل دین پر قائم تھے)۔ نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دینِ یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے کثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہلِ نجران میں سے ایک شخص دَوس ذُو ثُعلبان بھاگ نکلا اور ایک روایت کی رُو سے اُس نے قیصرِ روم کے پاس جا کر، اور دوسری روایت کی رُو سے حَبَش کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جا کر اس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رُو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا، اور دوسری روایت کی رُو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑہ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہرحال آخر کار حبش کی ۷۰ ہزار فوج اَریاط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی، ذو نواس مارا گیا، یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

اسلامی مؤرخین کے بیانات کی نہ صرف تصدیق دوسرے تاریخی ذرائع سے ہوتی ہے بلکہ ان سے بہت سی مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یمن پر سب سے پہلے عیسائی حبشیوں کا قبضہ ۳۴۰ء میں ہوا تھا اور ۳۷۸ء تک جاری رہا تھا۔ اُسی زمانے میں عیسائی مشنری یمن میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ اُسی کے قریب دور میں ایک زاہد عابد اور صاحبِ کشف و کرامات عیسائی سیاح فیمیون (FAYMIYUN) نامی نجران پہنچا اور اس نے وہاں کے لوگوں کو بُت پرستی کی بُرائی سمجھائی اور اس کی تبلیغ سے اہلِ نجران عیسائی ہو گئے۔ ان لوگوں کا نظام تین سردار چلاتے تھے۔ ایک سید، جو قبائلی شیوخ کی طرح بڑا سردار اور خارجی معاملات، معاہدات اور فوجوں کی قیادت کا ذمہ دار تھا۔ دوسرا عاقب، جو داخلی معاملات کا نگران تھا۔ تیسرا اُسقف (بشپ)، جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ جنوبی عرب میں نجران کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ ٹسر، چمڑے اور اسلحہ کی صنعتیں یہاں چل رہی تھیں۔ مشہور حُلّۂ یمانی بھی یہیں تیار ہوتا تھا۔ اِسی بنا پر محض مذہبی وجوہ ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی وجوہ سے بھی ذُونُواس نے اِس اہم مقام پر حملہ کیا۔ نجران کے سید حارثہ کو جسے سُریانی مؤرخین ARETHAS لکھتے ہیں، قتل کیا، اس کی بیوی رومہ کے سامنے اس کی دو بیٹیوں کو مار ڈالا اور اسے ان کا خون پینے پر مجبور کیا، پھر اسے بھی قتل کر دیا۔ اُسقف پال (PAUL) کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا دیں۔ اور آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے، پادری، راہب، سب کو پھینکوا دیا۔ مجموعی طور پر ۲۰ سے چالیس ہزار تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ آخرکار ۵۲۵ء میں حبشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذُونُواس اور اُس کی حِمیَری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اِس کی تصدیق حِصنِ غُراب کے کتبے سے ہوتی ہے جو یمن میں موجودہ زمانہ کے محققینِ آثارِ قدیمہ کو ملا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی متعدد عیسائی تحریرات میں اصحاب الاُخدود کے اس واقعہ کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض عین زمانہ حادثہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سُن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے مصنف اِس واقعہ کے ہم عصر ہیں۔ ایک پروکوپیوس، دوسرا کوسماس انڈیکوپلیوسٹس (COSMAS INDICOPLEUSTIS) جو نجاشی ایلیسبوعان (ELESBOAN) کے حکم سے اُس زمانے میں بطلیموس کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا اور حبش کے ساحلی شہر اَدولیس (ADOLIS) میں مقیم تھا۔ تیسرا یوحنّس مَلالا (JOHANNES MALALA) جس سے بعد کے متعدد مؤرخین نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یوحنّس اِفسوسی (JOHANNES OF EPHESUS) متوفی ۵۸۵ء نے اپنی تاریخ کلیسہ

اپنی ذات میں آپ محمود ہے، جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے، اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔[شه]

میں نصاریٰ نجران کی تعذیب کا قصہ اِس واقعہ کے معاصر راوی اُسقف مارشمعون (SIMEON) کے ایک خط سے نقل کیا ہے جو اُس نے دیرِ جَبلَہ کے رئیس (ABBOT VON GABULA) کے نام لکھا تھا، اور مارشمعون نے اپنے خط میں یہ واقعہ اُن اہلِ یمن کے آنکھوں دیکھے بیان سے روایت کیا ہے جو اس موقع پر موجود تھے۔ یہ خط ۱۸۸۱ء میں روم سے اور ۱۸۹۰ء میں شہدائے مسیحیت کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔ یعقوبی بطریق ڈایونیسیوس (PATRIARCH DIONYSIUS) اور زکریا مدیلی (ZACHARIA OF MITYLENE) نے اپنی سریانی تاریخوں میں بھی اِس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ یعقوب سُروجی کی کتاب دربابِ نصاریٰ نجران میں بھی یہ ذکر موجود ہے۔ الرُّھا (EDESSA) کے اسقف پولس (PULUS) نے نجران کے ہلاک شدگان کا مرثیہ لکھا جو اب بھی دستیاب ہے۔ سریانی زبان کی تصنیف کتاب الحِمیَریین کا انگریزی ترجمہ (BOOK OF THE HIMYARITES) ۱۹۲۴ء میں لندن سے شائع ہوا ہے اور وہ مسلمان مؤرخین کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اُس عہد اور اس سے قریبی عہد کے کچھ حبشی مخطوطات بھی موجود ہیں جو اِس قصے کی تائید کرتے ہیں۔ فِلبی نے اپنے سفرنامے (ARABIAN HIGHLANDS) میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاُخدود کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اُمّ خَرَق کے پاس ایک جگہ چٹانوں میں کھدی ہوئی کچھ تصویریں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور کعبۂ نجران جس جگہ واقع تھا اس کو بھی آج کل کے اہلِ نجران جانتے ہیں۔

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت بنائی تھی جسے وہ مکّہ کے کعبہ کی جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس کے اَساقِفہ عمامے باندھتے تھے اور اس کو حرم قرار دیا گیا تھا۔ رومی سلطنت بھی اِس کعبہ کے لیے مالی اعانت بھیجتی تھی۔ اِسی کعبۂ نجران کے پادری اپنے سیّد اور عاقِب اور اُسقُف کی قیادت میں مناظرے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مُباہلہ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سُورۂ آلِ عمران آیت ۶۱ میں کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران حاشیہ ۲۹ تا ۵۵)۔

شه ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے اُن اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بنا پر وہی اس کا مستحق ہے کہ اُس پر ایمان لایا جائے، اور وہ لوگ ظالم ہیں جو اس بات پر بگڑتے ہیں کہ کوئی اس پر ایمان لائے۔

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم و ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے۔[۶] جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، یقیناً اُن کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی، یہ ہے بڑی کامیابی۔

درحقیقت تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اور وہ بخشنے والا ہے محبت کرنے والا ہے، عرش کا مالک ہے، بزرگ و برتر ہے، اور جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے۔[۷] کیا تمہیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی؟[۸] مگر جنہوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ (ان کے جھٹلانے سے اس قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا) بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے اُس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے۔[۹] ع ۱ع

---

۶ جہنم کے عذاب سے الگ جلائے جانے کی سزا کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ انہوں نے مظلوم لوگوں کو آگ کے گڑھے میں پھینک کر زندہ جلایا تھا۔ غالباً یہ جہنم کی عام آگ سے مختلف اور اس سے زیادہ سخت کوئی اور آگ ہوگی جس میں وہ جلائے جائیں گے۔

۷ "بخشنے والا ہے" کہہ کر یہ امید دلائی گئی ہے کہ کوئی اگر اپنے گناہوں سے باز آکر توبہ کرلے تو اس کے دامنِ رحمت میں جگہ پا سکتا ہے۔ "محبت کرنے والا" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کو اپنی خلق سے عداوت نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس کو مبتلائے عذاب کرے، بلکہ جس مخلوق کو اس نے پیدا کیا ہے اُس سے وہ محبت رکھتا ہے اور سزا صرف اُس وقت دیتا ہے جب وہ سرکشی سے باز ہی نہ آئے۔ "مالکِ عرش" کہہ کر انسان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ سلطنتِ کائنات کا فرمانروا وہی ہے، اُس سے سرکشی کرنے والا اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ "بزرگ و برتر" کہہ کر انسان کو اس کمینہ پن پر متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسی ہستی کے مقابلہ میں گستاخی کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اور آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے"، یعنی پوری کائنات میں کسی کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ جس کام کا ارادہ کرے اس میں وہ مانع و مزاحم ہو سکے۔

۸ روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اپنے طاقتور جتھوں کے زعم میں خدا کی زمین پر سرکشیاں کر رہے ہیں۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ کچھ تمہیں خبر بھی ہے کہ اس سے پہلے جن لوگوں نے اپنے جتھوں کی طاقت کے بل پر یہی سرکشیاں کی تھیں وہ کس انجام سے دوچار ہو چکے ہیں۔

۹ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کا لکھا اَمِٹ ہے، اٹل ہے، خدا کی اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کے اندر کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا، جو بات اس میں لکھ دی گئی ہے وہ پوری ہو کر رہنے والی ہے، تمام دنیا مل کر بھی اسے باطل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔

تفہیم القرآن

الطارق

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ الطارق کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کے مضمون کا اندازِ بیان مکۂ معظمہ کی ابتدائی سورتوں سے ملتا جلتا ہے، مگر یہ اُس زمانے کی نازل شدہ ہے جب کفارِ مکہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے ہر طرح کی چالیں چل رہے تھے۔

موضوع اور مضمون | اِس میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کو مرنے کے بعد خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن ایک قولِ فیصل ہے جسے کفار کی کوئی چال اور تدبیر زک نہیں دے سکتی۔

سب سے پہلے آسمان کے تاروں کو اِس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک ہستی کی نگہبانی کے بغیر اپنی جگہ قائم اور باقی رہ سکتی ہو۔ پھر انسان کو خود اُس کی اپنی ذات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کس طرح نطفے کی ایک بُوند سے اُس کو وجود میں لایا گیا اور جیتا جاگتا انسان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو خدا اِس طرح اُسے وجود میں لایا ہے وہ یقیناً اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور یہ دوبارہ پیدائش اِس غرض کے لیے ہوگی کہ انسان کے اُن تمام رازوں کی جانچ پڑتال کی جائے جن پر دنیا میں پردہ پڑا رہ گیا تھا۔ اُس وقت اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے سے انسان نہ اپنے بل بوتے پر بچ سکے گا اور نہ کوئی اس کی مدد کو آسکے گا۔

خاتمۂ کلام پر ارشاد ہوا ہے کہ جس طرح آسمان سے بارش کا برسنا اور زمین سے درختوں اور فصلوں کا اُگنا کوئی کھیل نہیں بلکہ ایک سنجیدہ کام ہے، اسی طرح قرآن میں جو حقائق

بیان کیے گئے ہیں وہ بھی کوئی ہنسی مذاق نہیں ہیں بلکہ پختہ اور اٹل باتیں ہیں۔ کفار اس غلط فہمی میں ہیں کہ ان کی چالیں اِس قرآن کی دعوت کو زک دے دیں گی، مگر انہیں خبر نہیں ہے کہ اللہ بھی ایک تدبیر میں لگا ہوا ہے اور اس کی تدبیر کے آگے کفار کی چالیں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ پھر ایک فقرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی اور در پردہ کفار کو یہ دھمکی دے کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ آپ ذرا صبر سے کام لیں اور کچھ مدت کفار کو اپنی سی کر لینے دیں۔ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ اِن کی چالیں قرآن کو زک دیتی ہیں یا قرآن اُسی جگہ غالب آکر رہتا ہے جہاں یہ اُسے زک دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا تارا۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو[1]۔ پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے[2]۔ ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے

---

[1] نگہبان سے مراد خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی دیکھ بھال اور حفاظت کر رہی ہے جس کے وجود میں لانے سے ہر شے وجود میں آئی ہے، جس کے باقی رکھنے سے ہر شے باقی ہے، جس کے سنبھالنے سے ہر شے اپنی جگہ سنبھلی ہوئی ہے، اور جس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات بہم پہنچانے اور اُسے ایک مدت مقررہ تک آفات سے بچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اِس بات پر آسمان کی اور رات کی تاریکی میں نمودار ہونے والے ہر تارے اور سیارے کی قسم کھائی گئی ہے (النجم الثاقب کا لفظ اگرچہ لغت کے اعتبار سے واحد ہے لیکن مُراد اُس سے ایک ہی تارا نہیں بلکہ تاروں کی جنس ہے)، یہ قسم اس معنی میں ہے کہ رات کو آسمان میں یہ بے حد و حساب تارے اور سیارے جو چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں اِن میں سے ہر ایک کا وجود اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی ہے جس نے اُسے بنایا ہے، روشن کیا ہے، فضا میں معلق رکھ چھوڑا ہے، اور اِس طرح اس کی حفاظت و نگہبانی کر رہا ہے کہ نہ وہ اپنے مقام سے گرتا ہے، نہ بے شمار تاروں کی گردش کے دوران میں وہ کسی سے ٹکراتا ہے اور نہ کوئی دوسرا تارا اس سے ٹکراتا ہے۔

[2] عالم بالا کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب انسان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ خود ذرا اپنی ہستی

کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ جس روز

ہی پر غور کرے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ کون ہے جو باپ کے جسم سے خارج ہونے والے اربوں جرثوموں میں سے ایک جرثومے اور ماں کے اندر سے نکلنے والے بکثرت بیضوں میں سے ایک بیضے کا انتخاب کر کے دونوں کو کسی وقت جوڑ دیتا ہے اور اس سے ایک خاص انسان کا استقرارِ حمل واقع ہو جاتا ہے؟ پھر کون ہے جو استقرارِ حمل کے بعد سے ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ اُسے نشوونما دے کر اسے اس حد کو پہنچاتا ہے کہ وہ ایک زندہ بچے کی شکل میں پیدا ہو؟ پھر کون ہے جو رحمِ مادر ہی میں اس کے جسم کی ساخت اور اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا تناسب قائم کرتا ہے؟ پھر کون ہے جو پیدائش سے لے کر موت کے وقت تک اس کی مسلسل نگہبانی کرتا رہتا ہے؟ اسے بیماریوں سے بچاتا ہے۔ حادثات سے بچاتا ہے۔ طرح طرح کی آفات سے بچاتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کے اتنے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے لیے ہر قدم پر دنیا میں باقی رہنے کے وہ مواقع فراہم کرتا ہے جن میں سے اکثر کا اُسے شعور تک نہیں ہوتا کجا کہ وہ انہیں خود فراہم کرنے پر قادر ہو۔ کیا یہ سب کچھ ایک خدا کی تدبیر اور نگرانی کے بغیر ہو رہا ہے؟

۳؎ اصل میں صُلب اور ترائب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صُلب ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں، اور ترائب کے معنی ہیں سینے کی ہڈیاں، یعنی پسلیاں۔ چونکہ عورت اور مرد دونوں کے مادۂ تولید انسان کے اُس دھڑ سے خارج ہوتے ہیں جو صُلب اور سینے کے درمیان واقع ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ انسان اُس پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ مادہ اُس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے جبکہ ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کے پورے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ درحقیقت جسم کے اعضاءِ رئیسہ اس کے ماخذ ہیں، اور وہ سب آدمی کے دھڑ میں واقع ہیں۔ دماغ کا الگ ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ صُلب اُس کا وہ حصہ ہے جس کی بدولت ہی جسم کے ساتھ دماغ کا تعلق قائم ہوتا ہے۔

۴؎ یعنی جس طرح وہ انسان کو وجود میں لاتا ہے اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی کرتا ہے، یہی اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ اُسے موت کے بعد پلٹا کر پھر وجود میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ پہلی چیز پر قادر تھا اور اُسی قدرت کی بدولت انسان دنیا میں زندہ موجود ہے، تو آخر کیا معقول دلیل یہ گمان کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کہ دوسری چیز پر وہ قادر نہیں ہے۔ اِس قدرت کا انکار کرنے کے لیے آدمی کو سرے سے اِس بات ہی کا انکار کرنا ہوگا کہ خدا اُسے وجود میں لایا ہے، اور جو شخص اِس کا انکار کرے اُس سے

پوشیدہ اَسرار کی جانچ پڑتال ہوگی [۵] اُس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی [۶] اور (نباتات اُگتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی، یہ ایک جچی تُلی بات ہے، ہنسی مذاق نہیں ہے [۷]۔ یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں [۸] اور میں بھی

کچھ بعید نہیں کہ ایک روز اُس کے دماغ کی خرابی اُس سے یہ دعویٰ بھی کرا دے کہ دنیا کی تمام کتابیں ایک حادثہ کے طور پر چھپ گئی ہیں، دنیا کے تمام شہر ایک حادثہ کے طور پر بن گئے ہیں، اور زمین پر کوئی اتفاقی حادثہ ایسا ہو گیا تھا جس سے تمام کارخانے بن کر خود بخود چلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا اور اس کا ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے باقی رہنا اُن تمام کاموں سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ عمل ہے جو انسان کے ہاتھوں دُنیا میں ہوتے اور ہو رہے ہیں۔ اتنا بڑا پیچیدہ عمل اِس حکمت اور تناسب اور تنظیم کے ساتھ اگر اتفاقی حادثہ کے طور پر ہو سکتا ہو تو پھر کونسی چیز ہے جسے ایک دماغی مریض حادثہ نہ کہہ سکے؟

[۵] پوشیدہ اَسرار سے مراد ہر شخص کے وہ اعمال بھی ہیں جو دنیا میں ایک راز بن کر رہ گئے، اور وہ معاملات بھی ہیں جو اپنی ظاہری صورت میں تو دنیا کے سامنے آئے مگر ان کے پیچھے جو نیتیں اور اغراض اور خواہشات کام کر رہی تھیں، اور ان کے جو باطنی محرکات تھے اُن کا حال لوگوں سے چُھپا رہ گیا قیامت کے روز یہ سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا اور جانچ پڑتال صرف اِسی بات کی نہیں ہوگی کہ کس شخص نے کیا کچھ کیا، بلکہ اس بات کی بھی ہوگی کہ کس وجہ سے کیا، کس غرض اور کس نیت اور کس مقصد سے کیا۔ اِسی طرح یہ بات بھی ساری دنیا سے، حتیٰ کہ خود ایک فعل کرنے والے انسان سے بھی مخفی رہ گئی ہے کہ جو فعل اُس نے کیا اُس کے کیا اثرات دنیا میں ہوئے، کہاں کہاں پہنچے، اور کتنی مدت تک چلتے رہے۔ یہ راز بھی قیامت ہی کے روز کھلے گا اور اِس کی پوری جانچ پڑتال ہوگی کہ جو بیج کوئی شخص دنیا میں بو گیا تھا اس کی فصل کس کس شکل میں کب تک کٹتی رہی اور کون کون اسے کاٹتا رہا۔

[۶] آسمان کے لیے ذات الرجع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رَجع کے لغوی معنی تو پلٹنے کے ہیں، مگر مجازاً عربی زبان میں یہ لفظ بارش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ بس ایک ہی دفعہ برس کر نہیں رہ جاتی بلکہ بار بار اپنے موسم میں اور کبھی خلافِ موسم پلٹ پلٹ کر آتی ہے اور وقتاً فوقتاً برستی رہتی ہے۔ ایک اور وجہ بارش کو رجع کہنے کی یہ بھی ہے کہ زمین کے سمندروں سے پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے اور پھر پلٹ کر زمین ہی پر

ایک چال چل رہا ہوں۹ پس چھوڑ دو اے نبی، اِن کافروں کو اِک ذرا کی ذرا اِن کے حال پر چھوڑ دو۱۰ ع ۱

برستا ہے۔

۷ یعنی جس طرح آسمان سے بارشوں کا برسنا اور زمین کا شق ہو کر نباتات اپنے اندر سے اُگلنا کوئی مذاق نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے، اُسی طرح قرآن جس چیز کی خبر دے رہا ہے کہ انسان کو پھر اپنے خدا کی طرف پلٹنا ہے، یہ بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ ایک دوٹوک بات ہے، ایک سنجیدہ حقیقت ہے، ایک اٹل قولِ حق ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

۸ یعنی یہ کفّار اس قرآن کی دعوت کو شکست دینے کے لیے طرح طرح کی چالیں چل رہے ہیں۔ اپنی پھونکوں سے اس چراغ کو بجھانا چاہتے ہیں۔ ہر قسم کے شبہات لوگوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں۔ ایک سے ایک جھوٹا الزام تراش کر اِس کے پیش کرنے والے نبی پر لگا رہے ہیں تاکہ دنیا میں اُس کی بات چلنے نہ پائے اور کفر و جاہلیت کی وہی تاریکی چھائی رہے جسے چھانٹنے کی وہ کوشش کر رہا ہے۔

۹ یعنی مَیں یہ تدبیر کر رہا ہوں کہ اِن کی کوئی چال کامیاب نہ ہونے پائے، اور یہ آخر کار منہ کی کھا کر رہیں، اور وہ نور پھیل کر رہے جسے یہ بجھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

۱۰ یعنی انہیں ذرا مہلت دو کہ جو کچھ یہ کرنا چاہیں کر دیکھیں۔ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ نتیجہ اِن کے سامنے خود آجائے گا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تدبیر کے مقابلے میں اِن کی چالیں کتنی کارگر ہوئیں۔

اسلام میں صدقہ و احسان کی اہمیت

از : شیخ یوسف القرضاوی
ترجمہ : عبد الحمید صدیقی

اسلام نے زکوٰۃ وغیرہ کے جو قوانین وحقوق مقرر کیے ہیں وہ ان سب سے بڑھ کر جود وسخا کرنے والے انسان کے دل کو ایک ایسے آدمی کا دل بنانا چاہتا ہے جو طلب سے کہیں زیادہ دیتا ہے اور جتنا اس پر خرچ کرنا واجب ہو اس سے کہیں زیادہ خرچ کرتا ہے بلکہ بے طلب و سوال عطا کرتا ہے اور خوشحالی و بدحالی میں شب و روز پوشیدہ طور پر اور علانیہ خرچ کرتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی وہی چیز پسند کرتا ہے جو خود اُسے اپنے لیے پسند ہو۔ بلکہ باوجود اپنی تنگ دستی کے دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے اور مال کو مقصد نہیں بلکہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ مال کو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا ایک ذریعہ تصور کرتا ہے۔ اس کا دل خیر و خوبی کا مرقع بن جاتا ہے۔ وہ رضائے الٰہی اور ثواب کی نیت سے نہ کہ حُبِّ جاہ و شہرت کی خاطر یا حاکمِ وقت کی سزا کے خوف سے، خوب دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چند قوانین اور قواعد وضوابط ہی سب کچھ ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں وہ سطح بین ہیں اور انسان کی حقیقت سے ناآشنا۔ انسان کوئی مشین نہیں ہے کہ اُسے گھومایا جائے تو وہ گھومنے لگے۔ کوئی پہیہ نہیں ہے کہ اُسے حرکت دی جائے تو وہ متحرک ہو جائے اور روکا جائے تو رک جائے۔ وہ تو ایک ایسا پیچیدہ ڈھانچہ ہے جو مادہ اور رُوح، جسم اور جان، عقل اور جذبات اور افکار و احساسات سے مرکب ہے۔ وہ تو ایک ایسا وجود ہے جو سوچتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔ جو کسی چیز کو محسوس کرتا ہے اور اس کا شعور حاصل کرتا ہے جو بعض چیزوں کو اختیار کرتا ہے اور انہیں دوسری چیزوں پر ترجیح دیتا ہے اور بعض کاموں کو کرتا ہے اور بعض کو ترک کرتا ہے اور جو بعض چیزوں یا لوگوں سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اُن پر اثر انداز بھی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس وجودِ انسانی کے جملہ خصائص کا لحاظ رکھا جائے اور اس کے سازِ زندگی کے سارے تاروں پر زخمہ زنی کی جائے تاکہ ہم اس کے اخلاق اور

ضمیر کے ذریعے زندگی کے دوسرے قوانین اور قواعد و ضوابط کی کمی کو پورا کر سکیں۔

اسلام بحیثیت ایک دین ہونے کے صرف اُن حقوق پر توجہ دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا جو کچھ قوانین و ضوابط کے تحت ہیں اور جن کے نفاذ کی ذمہ داری حکومتوں پر ہوتی ہے بلکہ انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو پر بھی توجہ دیتا ہے کیونکہ زندگی کا یہ پہلو اسلام کی نظر میں صرف کفالتِ باہمی کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ نیک، رضائے الٰہی اور جنت میں انبیاء کی رفاقت کے طالب انسان کی تربیت سے جو مقاصد اسلام حاصل کرنا چاہتا ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

یہاں ہم کچھ آیاتِ قرآنی اور کچھ احادیثِ نبویؐ نقل کرتے ہیں جو بشارت و انذار، ترغیب و ترہیب، دعوتِ انفاق فی سبیل اللہ اور بخل و کنجوسی سے احتراز کی دعوت سے عبارت ہیں۔ جو فنی اعتبار سے اتنی اعلیٰ اور ادبی لحاظ سے اتنی بلیغ ہیں کہ اُن کی وعید جامد دلوں کو موم کر دیتی ہے اور اُن کے وعدے (یعنی اِن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جنت اور دیگر آرام و آسائش کے جو وعدے کیے ہیں) بند مٹھیوں کو حرکت میں لے آتے ہیں اور بھلائی اُن سے پھوٹ نکلتی ہے اور جود و سخا کے لیے وہ کھل جاتی ہیں۔ ارشادِ خداوندیؐ ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرہ: ۲۴۵)

تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور اُسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

(البقرہ ۲۶۱-۲۶۲)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے نہ دکھ دیتے ہیں اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی

رنج اور خوف کا موقع نہیں۔

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ (البقرہ: ۲۷۴)

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے۔ اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ ۔ (آل عمران: ۱۳۳-۱۳۴)

دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنّت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۔ وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۔

اے نبی! ان سے کہو میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے، جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے۔ وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے۔

وَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَنفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ۔ (الحدید: ۷)

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اُس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ، وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ (الحشر: ۹)

اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

وَأَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا

خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے روزی دی تم کو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔ تو

أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ ۔ (المنافقون)

پھر کہے اے میرے رب! کیوں نہ ڈھیل دی مجھ کو تھوڑی مدت کے لیے کہ میں خیرات کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا ۔

وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۔

اور جو نیک عمل تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اس کو خدا کے ہاں بہتر اور صلے میں بزرگ تر پاؤ گے ۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۔ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۔ (البلد ۱۱-۱۸)

مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا ۔ اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی کی گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا، یتیم رشتہ دار کو یا فقیر خاکسار کو ۔ پھر اُن لوگوں میں بھی داخل ہُوا جو ایمان لائے اور صبر کی نصیحت اور (لوگوں پر) شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے ۔ یہی لوگ صاحبِ سعادت ہیں ۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۔ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۔ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۔

(الدھر: ۸-۱۰)

اور باوجودیکہ اُن کو خود طعام کی خواہش اور حاجت ہے فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں نہ شکر گزاری کے طلب گار ۔ ہم کو اپنے پروردگار سے اس دن کا ڈر لگتا ہے جو (چہروں کو) کریہ المنظر اور (دلوں کو) سخت (مضطر کر دینے والا) ہے ۔

احادیثِ نبوی | حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”بندہ کہتا ہے میرا مال، میرا مال ۔ اس کا مال تو صرف وہ ہے جو اُس نے کھا لیا اور ختم ہو گیا اور جو اس نے پہن لیا اور بوسیدہ ہو گیا اور جو اُس نے راہِ خدا میں دے دیا ۔ اِس کے علاوہ جو کچھ بھی اُس کے پاس ہو گا وہ اسے دوسرے لوگوں کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا ۔ (مسلم)

حضرت ابنِ مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم میں سے کون ہے،

جسے اپنے وارثوں کا مال خود اپنے مال سے زیادہ پیارا ہے؟" صحابہؓ نے کہا: "اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے اپنا مال زیادہ پیارا نہ ہو۔" آپؐ نے فرمایا: "بے شک تم میں سے ہر ایک کا اصل مال وہ ہے جسے تم راہِ خدا میں خرچ کر کے اللہ کے ہاں ذخیرہ کر لو۔ اور وارثوں کا مال وہ ہے جسے تم پیچھے چھوڑ جاؤ۔ (نسائی)۔

عدی ابن حاتم سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تم میں سے ہر شخص سے ہم کلام ہوگا۔ اس حال میں کہ اللہ اس شخص کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ پھر وہ شخص اپنی دائیں طرف دیکھے گا تو اُسے وہی نظر آئے گا جو اس نے آگے بھیجا ہوگا۔ بائیں طرف دیکھے گا تو بھی وہی نظر آئے گا آگے دیکھے گا تو کچھ نہیں سجھائی دے گا۔ سوائے اس آگ کے جو اس کے سامنے ہوگی۔ لہٰذا آگ سے بچو، اگرچہ ایک کھجور برابر صدقہ دے کر ہی کیوں نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر کوئی شخص اپنی حلال کمائی میں سے ایک کھجور برابر صدقہ کرے، اور حلال کمائی ہی کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے بڑے احسن انداز سے قبول کرتا ہے، پھر اُسے صدقہ کرنے والے کے فائدے کے لیے پالتا رہتا ہے (بڑھاتا رہتا ہے)، جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کو پالتا ہے حتیٰ کہ وہ (صدقہ) ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صدقہ گناہ کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو۔" (ابو یعلیٰ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک درہم ایک لاکھ درہم سے بڑھ گیا۔" ایک شخص نے عرض کی: "اے خدا کے رسول! وہ کیسے؟" آپؐ نے فرمایا: "ایک نہایت مالدار شخص اپنے مال میں سے ایک لاکھ درہم لے اور صدقہ کر دے۔ اور دوسرا شخص جس کے پاس کل دو درہم ہیں وہ اپنے مال میں سے ایک درہم صدقہ کر دے (تو قلیل المال شخص کا یہ ایک درہم کثیر المال شخص کے ایک لاکھ درہم سے اللہ کے نزدیک ثواب میں کہیں بڑھ کر ہوگا)۔ (نسائی۔ ابن خزیمہ۔ ابن حبان۔ حاکم۔)

عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے روز ہر شخص

اپنے صدقے کے سائے میں ہوگا یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان جنت و دوزخ کا فیصلہ کر دیا جائیگا۔ (احمد۔ ابنِ خزیمہ۔ ابنِ حبان۔ حاکم)۔

قارئین کرام ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ مذکورۃ بالا آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی مسلمانوں کی عملی زندگی کا دھارا بدلنے میں بالکل غیر مؤثر ہیں۔ نہیں بلکہ یہ تو انسان کے پاکیزہ ترین احساسات، شریفانہ جذبات، بہترین عزائم اور نیک اعمال میں دلچسپی کی تربیت و تدریب میں مشعلِ راہ اور قوتِ دافعہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اپنی اس بات کی تائید میں ہم تاریخِ اسلام سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

مفسرین حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا، جب آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضَاعِفَہٗ لَہٗ (ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے اور اللہ تعالیٰ اُسے بڑھا چڑھا کر عطا کرے) نازل ہوئی تو حضرت ابوالدحداح انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا "یارسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب فرماتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں اے ابو دحداح"! انہوں نے کہا "یارسول اللہ اپنا ہاتھ دیجیے" پھر ہاتھ میں ہاتھ لے کر کہا "حضور! مَیں نے اپنا باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیا" ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ابودحداح کے باغ میں چھ سو کھجور کے درخت تھے اور اُن کے بیوی بچے بھی اُسی میں رہتے تھے۔ وہ اس وقت سیدھے باغ میں آئے اور آواز دی "اے دحداح کی ماں"! اس نے جواب دیا "لبیک"۔ ابودحداح نے کہا "بچوں کو لیکر باغ سے نکل آؤ کیونکہ مَیں نے یہ باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دے دیا ہے (یعنی راہِ خدا میں دے دیا ہے)

امام احمدؒ نے حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ تمام انصار میں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ مالدار تھے۔ وہ اپنے تمام مال اور جائیداد میں "بیرحاء" نامی باغ کو جو مسجد نبویؐ کے سامنے تھا، سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اکثر اس باغ میں جایا کرتے تھے اور اس کے کنوئیں کا عمدہ میٹھا پانی پیا کرتے تھے۔ جب آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے) نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حاضر ہوکر آپؐ سے عرض کیا: یارسول اللہ! خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے۔ اور میرا سب سے زیادہ عزیز مال یہی بیرحاء نامی باغ ہے۔ لہٰذا مَیں اس کو اس اُمید میں کہ جو بھلائی خداوند تعالیٰ کے پاس ہے وہی میرے لیے جمع رہے

خدا تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ اب اے اللہ کے رسولؐ! آپ کو اختیار ہے جس طرح مناسب سمجھیں اس کو تقسیم کر دیں۔ آپؐ خوش ہو کر فرمانے لگے "واہ واہ یہ بہت ہی فائدہ مند مال ہے اس سے لوگوں کو بہت ہی فائدہ ہو گا۔ پھر فرمایا "میری رائے یہ ہے کہ تم اس باغ کو اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ "بہت اچھا" اور پھر اسے اپنے رشتہ داروں اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

انفاق فی سبیل اللہ کا یہ سلسلہ ہر دور میں مختلف درجوں پر جاری رہا ہے اور لوگوں نے تاریخ کے ہر دور میں اس کے نہایت اعلیٰ و عمدہ نمونے دیکھے ہیں کہ مسلمان کے نزدیک اللہ، اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان دونوں کی خوشنودی، اپنے خزانوں سونے چاندی اور دنیاوی زندگی کی ہر متاعِ گراں بہا سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔

امام لیثؒ بن سعد کے بارے میں روایت ہے کہ اُن کی آمدنی تقریباً ہزار دینار فی یوم تھی۔ اس کے باوجود اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ اپنے مال کو اتنی دیر اپنے پاس جمع رکھتے ہی نہیں تھے کہ اس پر سال گزر جائے بلکہ جو بھی مال ان کے پاس آتا تھا وہ اُسے صدقہ کر دیتے تھے اور راہِ خدا میں خرچ کر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امام لیثؒ ہر روز تین سو ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے سے پہلے بات نہیں کرتے تھے۔ اور کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک عورت نے آپ سے کچھ شہد مانگا۔ آپ نے حکم دیا کہ اسے ایک مشکیزہ شہد کا دے دو۔ آپ سے کہا گیا کہ وہ تو اس سے کم شہد پر بھی راضی ہو سکتی تھی۔ آپ نے جواب دیا "اس نے اپنی ضرورت کے مطابق سوال کیا، ہم نے اللہ تعالیٰ کے اُس انعام کے مطابق دیا جو اس نے ہم پر کر رکھا ہے۔

اسی طرح عبداللہ بن جعفر کے متعلق کہتے ہیں کہ انہوں نے کسی حاجتمند سائل کو اپنے دروازے سے کبھی خالی ہاتھ نہیں موڑا تھا۔ اُن کے کسی ہم نشین نے یہ رویّہ اختیار کرنے پر انہیں بُرا بھلا کہا تو انہوں نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک عادت ڈال دی اور میں نے اس کے بندوں کو ایک عادت ڈال دی۔ اس نے مجھے اس بات کا خوگر بنایا کہ وہ مال و دولت دے اور میں نے اس کے بندوں کو اس بات کا عادی بنایا کہ میں انہیں مال دیتا رہوں۔ اب میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اپنی عادت کو چھوڑ دیا تو وہ بھی اپنی عادت کو چھوڑ دے گا۔

خیراتی وقف | صدقات میں سے اسلام نے جن چیزوں کی ترغیب دلائی ہے اُن میں سب سے اہم صدقہ جاریہ

ہے ۔ دوسرے صدقات کی جزاء و ثواب کی نسبت صدقہ جاریہ کی جزاء امتیازی حیثیت رکھتی ہے ۔ چونکہ صدقہ جاریہ کے اثر اور فائدے میں ایک قسم کا دوام اور ہمیشگی پائی جاتی ہے ۔ لہٰذا اس کا ثواب صدقہ کرنے والے کی موت کے بعد بھی اُس وقت تک اُسے پہنچتا رہتا ہے جب تک کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب انسان کا رشتۂ حیات ٹوٹ جاتا ہے تو سوائے مندرجۂ ذیل تین اعمال کے تمام اعمال اس سے منقطع ہو جاتے ہیں:

(۱) صدقۂ جاریہ ۔ (۲) نفع بخش علم (۳) دعائے خیر کرنے والا نیک بچّہ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں کچھ زمین ملی ۔ آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا " اے اللہ کے رسولؐ! میرا سب سے زیادہ عزیز اور بہتر مال وہ ہے جو خیبر میں میری زمین کا ایک حصّہ ہے (میں اس کو راہِ خدا میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں) فرمائیے کیا کروں ؟ آپؐ نے فرمایا " اصل (زمین) کو اپنے قبضے میں رکھو اور اس کی پیداوار پھل وغیرہ خدا کی راہ میں وقف کر دو " چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فقراء، رشتہ داروں، قیدیوں، ناداروں اور مسافروں کے لیے اُس زمین کی پیداوار پھل وغیرہ اس شرط پر وقف کر دیئے کہ نہ تو انہیں بیچا جائے ۔ نہ ہبہ کیا جائے اور نہ حصّہ وراثت کے طور پر دیا جائے ۔ البتہ جو شخص اس وقف کا نگران مقرر کیا جائے اس کے لیے کوئی گناہ نہیں اگر وہ معروف طریقے سے اس میں سے کچھ لے کر کھالے اور اپنی جائیداد نہ بنائے ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زمین کی پیداوار وغیرہ خدا کی راہ میں وقف کر دینے کا حکم دے کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خیراتی وقف کے لیے شرعی بنیاد مہیا کر دی ہے جو ہر دور کے مُسلم معاشرے میں کافی مؤثر کردار ادا کرتی رہی ہے اور جو مسلمانوں کے دلوں میں بھلائی اور خلوص و خیر کے جذبات کو جاگزیں کرنے کی ایک روشن مثال اور واضح دلیل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مُسلم معاشرے کی ضروریات میں سے کوئی ضرورت ایسی نہیں تھی جس کے لیے معاشرے کے اہلِ ثروت نے اپنی دولت کا کچھ حصّہ وقف نہ کر دیا ہو۔ یہ اوقاف اپنی وسعت اور تنوّع کے اعتبار سے بجا طور پر نظامِ اسلامی کے لیے باعثِ صد افتخار تھے ۔ فقراء اور ناداروں کے لیے محتاج خانے قائم کر دیئے گئے جو اُن کی خوراک اور رہائش کی ضروریات پوری کرتے تھے ۔ خیراتی شفاخانے کھول دیئے گئے جو فقراء اور اہلِ حاجت کے لیے علاج معالجے اور

دوا دارو کی سہولتیں مہیا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے لیے سفر وغیرہ کی سہولتیں بھی مہیا کی گئیں۔ مسلمان اس تلاش میں رہتے تھے کہ معاشرے میں کون کونسی ضروریات ایسی ہیں جن پر خرچ کیا جائے، پھر وہ اُن کے لیے اپنے مالوں اور جائیدادوں کے کچھ حصے وقف کر دیتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے بیمار جانوروں کے علاج اور گم شدہ (بے آقا) کتوں کی خوراک وغیرہ کے لیے اوقاف قائم کیے۔ جب بے زبان جانوروں کے بارے میں مسلمانوں کا یہ رحمدلانہ طرزِ عمل تھا تو پھر اس اشرف المخلوقات انسان کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ کیا ہوگا؟

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں اگر مسلم معاشرے میں یتیموں، شکستہ حال لوگوں، اندھوں، ناداروں اور دیگر مجبور اور آفت رسیدہ محتاجوں کے لیے اوقاف کا ایک نہایت وسیع نظام قائم ہو جائے۔

ہم یہاں مصر کے عہدِ ممالیک کی ایک تاریخی دستاویز کا متن پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، وہ دستاویز قلاؤون کے شفاخانے کا وقف نامہ ہے۔ وقف نامہ ایک سرکاری کاغذ ہوتا ہے جس پر وقف کرنے والا اپنے وقف کے متعلق ہر چیز تحریر کرتا ہے اور اس کے حدود مقرر کرتا ہے اور مسلمانوں میں سے کسی عادل اور نیک آدمی کو اس پر گواہ بنایا جاتا ہے تاکہ جس شخص کی نگرانی میں وقف ہو وہ اُن حدود کا پورا التزام کرے۔ وقف کے نگران کو "ناظر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مذکورہ شفاخانے کے وقف نامے میں لکھا ہے:

> "یہ شفاخانہ بیمار مسلمان مردوں اور عورتوں کے علاج معالجے کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ خواہ وہ خوشحال دولتمند ہوں یا فقیر محتاج۔ قاہرہ اور اس کے نواحی علاقوں میں رہتے ہوں یا باہر سے آئے ہوئے ہوں۔ اپنی جنسوں اور بیماریوں اور امراض کے اختلاف کے باوصف وہ اس ہسپتال میں اکٹھے یا علیحدہ علیحدہ اور بڑھاپے اور جوانی کے عالم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ مریض مرد اور عورتیں جو فقیر اور محتاج ہوں گے، اپنی کامل صحت یابی تک اپنے علاج کے لیے اس میں مقیم رہیں گے اور ہسپتال میں علاج وغیرہ کے لیے جو کچھ مہیا ہوگا وہ ہر اپنے اور پرائے اور مقامی اور مسافر پر غیر مشروط طور پر خرچ کیا جائے گا۔
>
> اور ناظر اس وقف کی آمدنی سے مریضوں کی ہر ضرورت پر خرچ کرے گا۔ مثلاً

بستر، لحاف اور گدّے وغیرہ۔ ہر مریض کے لیے اس کے مرض اور حالت کے مطابق چارپائی اور بچھونا مہیا کرے گا۔ تمام مریضوں کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ کے خوف اور اُس کی اطاعت کو پیشِ نظر رکھے گا اور اُن کو اپنی رعایا سمجھتے ہوئے اُن کی بھلائی اور بہتری کے لیے پورے خلوص سے جد و جہد کرے گا کیونکہ ہر راعی اپنی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا۔

مریضوں کے لیے مُرغ، چوزے اور دیگر گوشت وغیرہ پکانے کا انتظام ہسپتال کا مطبخ کرے گا۔ ہر مریض کے لیے جو کچھ پکایا جائے گا وہ اس کے لیے ایک خاص کٹورے میں ڈھانپ کر رکھ دیا جائے گا کوئی دوسرا مریض اس میں سے کچھ نہیں لے سکے گا۔ جب سب مریضوں کے لیے کھانا تیار ہو جائے گا تو ہر مریض کو اُس کا کھانا دے دیا جائے گا۔ رات دن کا جو کھانا ڈاکٹر صاحب اُن کے لیے تجویز کریں گے وہ انہیں پورا پورا دیا جائے گا۔

ناظر اس وقف کی آمدنی سے اُن مسلمان ڈاکٹروں کی تنخواہیں وغیرہ بھی دے گا جو اکٹھے یا باری باری سے مریضوں کی دیکھ بھال کا کام انجام دینگے اور اُن سے اُن کے احوال (یعنی مرض میں افاقہ یا شدّت) وغیرہ پوچھیں گے۔ اور کھانے پینے کی جو چیز بھی مریض کے لیے موزوں ہوگی وہ اُس کے نسخے میں لکھیں گے۔ اور اجتماعی طور پر یا باری باری سے ہر روز رات کو ہسپتال میں رہیں گے اور مریضوں کا علاج اور دیکھ بھال کریں گے۔

اگر کوئی شخص اپنے گھر میں بیمار ہو اور محتاج ہو تو ناظرِ شفاخانہ اُسے شربت، ادویہ اور معجونیں وغیرہ جن کی اُسے ضرورت ہو، مہیا کر سکتا ہے اور اسے اس معاملے میں خرچ کرتے وقت کنجوسی سے کام نہیں لینا ہوگا۔[1]

یہ تاریخی دستاویز اُس دَور کی ہے جسے مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کے سنہرے ادوار کے مقابلے میں پستی اور پسپائی کا دَور سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] منقول از لیس من الاسلام مؤلفہ محمد الغزالی ص ۲۱، ۲۵

عالمِ اِسلام

مصر کا تازہ انقلاب اور اُس کے اندرونی حقائق

(از جناب خلیل حامدی صاحب)

جمال عبدالناصر کی موت کے بعد منصبِ صدارت کے امیدواروں میں سب سے زیادہ جس کا نام لیا جا رہا تھا وہ علی صبری تھا جو سیاسی حلقوں میں "ماسکو کا آدمی" کہلاتا تھا۔ مگر حالات نے انورالسادات کو یہ منصب بخش دیا۔ اب علی صبری کی کوشش یہ تھی کہ وہ یا تو سادات کو ہٹا کر خود یا اپنے گروہ کے کسی فرد کو مصر کی صدارت پر براجمان کرے اور یا سادات کو اپنا تابع مُہمل بنا کر رکھے۔ پالیسی وہ خود بنائے اور سادات کا کام اس کی تنفیذ ہو۔ یُوں سادات اور علی صبری کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ اقتدار کی کشمکش نے سیاسی اختلاف کا روپ دھار لیا۔ اس کشمکش نے دو موقعوں پر شدت اختیار کر لی پہلا موقع وہ تھا جب سادات نے راجرز پلان کو قبول کر لیا۔ اِس پلان کی رُو سے مسئلہ فلسطین کو اجزاء میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ایک ایک جزء کو الگ طور پر حل کرنے کی اسکیم بنائی گئی تھی۔ چنانچہ سادات نے اس پلان کے تحت یہ بات منظور کر لی کہ پُورے مسئلہ فلسطین کو چھیڑے بغیر شروع میں صرف سویز کو کھول دینے کا منصوبہ بنایا جائے۔ علی صبری نے سادات کے اس موقف کی مخالفت کی۔ بظاہر اس مخالفت کا عنوان یہ تھا کہ مسئلہ فلسطین کا تجزیہ صحیح نہیں ہے۔ مگر اس مخالفت کا اصل پس منظر الحیات (بیروت) کے الفاظ میں یہ تھا:

"سادات نے جونہی راجرز پلان کے تحت گفت و شنید کو منظور کر لیا، علی صبری اور سادات کے درمیان اختلاف کا دبا ہوا لاوا اُبل کر باہر آ گیا۔ اس بنا پر نہیں کہ علی صبری فوجی حل کا حامی اور پُرامن حل کا مخالف ہے۔ بلکہ اس لیے کہ علی صبری ہر اُس سمجھوتے کے خلاف ہے جس میں روس کو مؤثر فریق کی حیثیت حاصل نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں مشرق اوسط کے قضیے کا جو سمجھوتہ صرف امریکیوں کی طرف سے پیش کیا جائے گا علی صبری اُسے قبول نہیں کرے گا۔ جب سادات نے سویز کو کھولنے کی تجویز منظور کر لی تو علی صبری نے اس دلیل کی بنا پر اُس کو

رد کر دیا کہ عبدالناصر بھی اس طرح کی تجویز کو رد کر چکا ہے۔ چنانچہ علی صبری نے بائیں بازو کے عناصر کو سادات کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔"[1]

سادات نے ۶ مئی ۱۹۷۱ء کو راجرز کا قاہرہ میں استقبال کیا اور اس کی آمد کے ۴ روز بعد (۲ مئی ۱۹۷۱ء) علی صبری کو نائب صدر کے منصب سے برطرف کر دیا۔ اس کے بعد وہ صرف سوشلسٹ یونین کی اعلیٰ انتظامی کمیٹی کا ممبر رہ گیا۔

دوسرا موقع سادات اور علی صبری کی باہمی رسہ کشی کا وہ ہے جب بنغازی میں سادات نے شام کے حافظ اسد اور لیبیا کے معمر قذافی سے مل کر اتحاد ثلاثی کے معاہدے پر دستخط کیے اور علی صبری نے اس معاہدے کی صاف صاف مخالفت کی۔ سادات کا موقف یہ تھا کہ اسرائیل کے ساتھ آئندہ نپٹنے کے لیے یہ اتحاد ضروری ہے۔ مگر علی صبری اور اس کا گروہ روس کی حکمتِ عملی کے تحت عرب اتحاد کا قائل نہیں ہے۔ اور خاص طور پر وہ ایسے اتحاد کو گوارا نہیں کر سکتا جس کا نقطۂ ماسکہ سوشلزم نہ ہو۔ اتحاد ثلاثی کا یہ حال ہے کہ حافظ اسد (شام) گو بعث ازم کا علمبردار ہے مگر کمیونسٹوں کے خلاف ہے۔ معمر قذافی بھی کمیونزم اور کمیونسٹوں کا شدید دشمن ہے۔ سوڈان کا جعفر نمیری بھی اس اتحاد میں شامل نہیں ہو سکا تھا کیونکہ سوڈان کے کمیونسٹ اس کے خلاف تھے۔ مگر سادات نے علی صبری کی مخالفت کے علی الرغم اتحاد کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اور یہ معاہدہ جب منظوری کے لیے مصر کی سوشلسٹ یونین کی اعلیٰ انتظامی کمیٹی کے اندر رکھا گیا تو اس کی مخالفت میں ۵ اور حق میں صرف ۳ ووٹ آئے۔ سادات نے یہ سمجھ کر کہ اعلیٰ انتظامی کمیٹی زیادہ تر علی صبری کے حامیوں پر مشتمل ہے اس معاملے کو سوشلسٹ یونین کی مرکزی کونسل میں بحث کے لیے منتقل کر دیا۔ علی صبری اور اس کے حامیوں نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنے آدمی بھجوا کر مرکزی کونسل کے ارکان کو آمادہ کر لیا کہ وہ اتحاد کی حمایت نہ کریں۔ چنانچہ جب کونسل کا اجلاس ہوا تو پہلی رائے شماری میں ۴۵ اتحاد کے خلاف اور ۵ حق میں ووٹ آئے۔ مگر سادات کے اصرار پر معاہدے میں بنیادی تبدیلیاں تجویز کر کے اُسے منظور کر لیا گیا۔ اس واقعے سے سادات کو اندازہ ہو گیا کہ آئندہ کتنے مضبوط گروپ کے ساتھ اُس کو پالا پڑنے والا ہے۔

اب اس پورے گروپ نے سادات کو صدارت سے الگ کرنے کی اسکیم بنالی۔ یہ گروہ بڑے با اثر لوگوں پر مشتمل تھا مثلاً محمد فوزی وزیر جنگ، شعراوی جمعہ نائب وزیر اعظم و وزیر داخلہ، سامی شرف

---

[1] الحیات (بیروت) ۱۲ مئی ۱۹۷۱ء

وزیر ریاست برائے امور صدارت، محمد فائق وزیر اطلاعات، لبیب شُقیر اسپیکر نیشنل اسمبلی، سعد زاید وزیر آبادکاری، حلمی سعید وزیر، عبدالحسن ابوالنور سکرٹری سوشلسٹ یونین، جنرل حسن طلعت ڈائرکٹر جنرل اپیلی جنس احمد کامل انسپکٹر جنرل پولیس اور بہت سے دوسرے افراد۔ یہ پورا گروپ ان عناصر پر مشتمل ہے جن کی بدولت جمال عبدالناصر مصر پر مدتِ دراز تک حکمرانی کرتا رہا۔ دوسرے لفظوں میں مصر میں حکمرانی کی زمامِ کار چار اداروں کے ہاتھ میں تھی:

۱۔ فوج جس کا پہلا سربراہ عبدالحکیم عامر تھا اور اس کے بعد محمد فوزی۔ الجدید (بیروت) لکھتا ہے: فوج ہمیشہ مصری حکومت کی محافظ رہی ہے۔ عبدالناصر کے عہد میں بڑے بڑے فوجی افسر حکومت کی حفاظت کا بنیادی کردار ادا کرتے تھے۔ عبدالناصر نے اپنے تمام معاونین فوج میں سے منتخب کر رکھے تھے۔ ایک ہزار پانچ سو بڑے بڑے فوجی افسروں کو سول عہدوں پر لگایا گیا۔[۱] چنانچہ فوج نے مصر کے اندر جو لوٹ کھسوٹ مچائی اور جس طرح مصری عوام کے جان و مال اور آبرو پر ڈاکے ڈالے اور جون ۶۷ء کی جنگ میں جو بھونڈا کردار ادا کیا۔ اسی کی وجہ سے عوام فوج سے اس قدر متنفر ہو گئے کہ جس فوجی افسر کو وردی میں دیکھتے اُسے اپنے نکتوں اور چٹکلوں کا نشانہ بناتے۔ یہاں تک کہ صدر ناصر کو یہ احکام جاری کرنے پڑے کہ کوئی فوجی افسر ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ وردی نہیں پہن سکتا۔ الجدید لکھتا ہے: "ناصر نے آخرکار ملٹری ہیڈکوارٹر کو یہ حکم جاری کیا کہ تمام افسران کو مطلع کر دیا جائے کہ وہ عام اوقات میں اپنا سرکاری لباس نہ پہنا کریں۔ فوج کے خلاف عوام کے اندر نفرت و حقارت کا طوفان اُبل پڑا جس کے نتیجے میں جمال عبدالناصر کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ سیاسی طاقت کی حیثیت سے فوج کو سامنے نہ لائے۔ فوجی افسروں کی بہت بڑی تعداد نے حکومت کی برکات سے سیاسی اور انتظامی قیادت پر قبضہ کر لیا اور ملک کے اندر وہ ایک نیا طبقہ بن کر سامنے آ گئی۔ اُس نے ایسا ظالمانہ راستہ اختیار کر لیا جس نے عوام کے اندر اس کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکا دی اور عوام چٹکلوں اور لطیفوں کے رنگ میں فوجیوں کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانے لگے۔"[۲]

۲۔ سوشلسٹ یونین۔ مصری میثاق کی رُو سے سوشلسٹ یونین مصر کا سب سے بڑا بااختیار ادارہ ہے جس کا اقتدار ریاست اور حکومت دونوں پر حاوی ہے۔ لیکن سوشلسٹ یونین کے لیڈروں نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر اپنی "اشتراکیت نوازی" کا جو ثبوت دیا ہے وہ مصر کا ہر فرد جانتا ہے ۱۹۶۵ء

[۱] الجدید ۱۸ جون ۱۹۷۱ء [۲] الجدید ایضاً

کے اواخر میں جب سوشلسٹ یونین کے ذمہ داروں کو یہ محسوس ہوا کہ یونین عوام کے غیظ و غضب کا براہِ راست نشانہ بن چکی ہے تو ان لوگوں نے سامی شرف وزیر ریاست برائے امور صدارت کے اشارہ پر یونین کے اندر ایک خفیہ تنظیم قائم کرلی۔ سامی شرف اس کا نگران اعلیٰ تھا اور شعراوی جمعہ وزیر داخلہ اس کا انچارج۔ انور السادات نے جب صدارت کا عہدہ سنبھالا تو اس وقت صرف قاہرہ میں اس خفیہ تنظیم کے ارکان کی تعداد ۵ ہزار تھی۔[1]

الحدید لکھتا ہے: "سوشلسٹ یونین کی اس خفیہ تنظیم نے مصر کے اندر خوف و ہراس اور بے اعتمادی کی شدید فضا پیدا کر رکھی تھی۔

اس تنظیم میں نمایاں افراد کو بڑی چھان بین کے بعد داخل کیا جاتا تھا۔ اس میں صحافی بھی شامل تھے، پولیس کے افسران بھی، وکلاء اور جج بھی اور سرکاری افسر بھی۔ تنظیم کی طرف سے ممبروں کو باقاعدہ ماہانہ اضافی معاوضہ ملتا تھا مثلاً کوئی جج اگر اس کا رکن بن جاتا تو اسے ڈھائی سو پونڈ اضافی تنخواہ دی جاتی تھی۔ ہر خفیہ رکن کی کم از کم تنخواہ ایک سو پونڈ تھی۔ اس تنظیم کی ڈیوٹی یہ تھی کہ سوشلسٹ نظام کی حمایت کرے۔ ملک کے اندر پھیلائی جانے والی ہر افواہ اور ہر کہانی کو تنظیم کے سربراہ شعراوی جمعہ تک پہنچائے اور بوقت ضرورت ان لوگوں کے حق میں مظاہرے منظم کرے"۔ ۔ ۔ "صحافت کے اندر بھی خفیہ تنظیم کے گھونسلے تھے تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ صحافیوں کے اندر ایک سو ساٹھ تنظیم کے تنخواہ دار ملازم تھے جو اخبارات سے بھی اپنا معاوضہ لیتے اور تنظیم سے بھی۔ ان میں روز الیوسف کے چیف ایڈیٹر کامل الزہیری، المصور کے چیف ایڈیٹر احمد بہاء الدین اور الجمہوریہ کے ایڈیٹر بھی شامل تھے۔ ہر دفتر اور ہر محکمے میں صف اول کے لوگوں کے اندر اس تنظیم کے ارکان موجود تھے"۔[2]

ایک مصری جج کا بیان ہے: "تم یہ تصور کر سکتے ہو کہ مصر کے اندر ایک گروپ ایسا موجود تھا جس کے پاس جدید ترین الیکٹرونک مشینری تھی۔ اور اس نے ایک ایسی خفیہ تنظیم قائم کر رکھی تھی کہ اگر وہ حرکت میں آ جاتی تو ایک مرتبہ پورا ملک خونریز داخلی انقلاب کی نذر ہو جاتا۔ یہ گروہ لاتعداد سرمائے کا مالک تھا اور اسے بے لگام اثر و نفوذ حاصل تھا۔ اطلاعات کے جملہ وسائل بھی اس کی ملکیت میں تھے۔ اور انہوں نے عام لوگوں کی جاسوسی کے لیے جو سسٹم نافذ کر رکھا تھا اس کی مثال کمیونسٹ ملکوں کے سوا کہیں نہیں ملتی۔

---

[1] الحدید بیروت، ۹ جولائی ۱۹۷۱ء [2] ایضاً

اس گروہ نے انسانوں پر بڑے ظلم وستم کیے۔ اگر کسی پختہ کار اور حشیش خور غنڈے کو ایک کیلو گرام حشیش دھنگ، پلا دی جائے اور اُسے کہا جائے کہ وہ لوگوں کو عذاب دینے کا انوکھے سے انوکھا طریقہ اختیار کرے تو اس کے دماغ میں بھی کم از کم یہ اسلوب نہ آئے گا کہ وہ تو خیز بچیوں پر اُن کے قیدی باپوں کے سامنے پولیس کے کُتّوں کو چھوڑے، یہ اسلوب اس گروہ نے اختیار کیا تھا۔[1]

اسی خفیہ تنظیم کے خلاف انور السادات نے آواز بلند کی تھی۔ اور وہ تمام کاغذات اور ٹیپیں اور دستاویزیں سرِ عام نذرِ آتش کر دی تھیں جن کے اندر ہر شخص کی عزت پر حملے کیے گئے تھے۔

۳۔ خفیہ پولیس - اس ادارے کا حال بھی یہ تھا کہ نامور عرب صحافی محمد صادق کے بیان کے مطابق:

"مارکسسٹ سی آئی ڈی کے محکمے میں گھس گئے اور انہوں نے مختلف لوگوں کے خلاف رپورٹیں لکھ لکھ کر بھیجیں۔ کرنل احمد جو پکا کمیونسٹ تھا اِن رپورٹوں کو وصول کرتا اور متعلقہ اشخاص کو جیلوں میں ڈلوا دیتا کیونکہ یہ لوگ تھے جنہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بنیادی آزادیوں اور جمہوری نظام کے بغیر وہ اس گروہ سے تعاون نہیں کر سکتے۔ انقلابی تحریک نے کمیونسٹوں کے ایک چلے بُھنے گروہ کو خرید لیا اور انہیں انٹیلی جنس بیورو میں مختلف کاموں پر لگا دیا۔ بعد میں انہی لوگوں کو مختلف سرکاری محکموں میں پھیلا دیا تاکہ ہر محکمے کے اندر جاسوسی کا کام کریں اور لوگوں کی گفتگوؤں کو حکومت تک پہنچائیں۔ مصر میں سب سے پہلے کمیونسٹوں نے مصریوں کو یہ تعلیم دینے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں کہ سیاسی تحریکوں کو کس طرح تشدد کے ساتھ ختم کیا جائے اور کس طرح قید و بند اور قتل و تعذیب کے ذریعہ مخالفین کی زبانیں بند کی جائیں۔ کرنل احمد انور نے اس قدر کشت و خون کیا اور اس قدر لوگوں پر افترا پردازی کی کہ وہ بالآخر پاگل ہو گیا۔ خود جمال سالم بھی مرضِ جنون میں مبتلا ہو گیا تھا اور اسی میں اس کی موت ہوئی۔ احمد انور اور جمال سالم پر جب بیماری کا دورہ پڑتا تھا تو وہ زمین پر گر جاتے اور شدتِ درد سے چیخیں مارتے یہاں تک کہ ان کی آواز بیٹھ جاتی۔ انگلستان امریکہ، فرانس اور روس تک کے ڈاکٹر اس بیماری کے اسباب دریافت کرنے سے عاجز آ گئے ——— مگر انہیں یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ جو شخص کسی دوسرے انسان پر بلا وجہ ظلم کرتا ہے وہ اللہ کے عذاب

---

[1] زہیر باروینی۔ القاہرہ بحوالہ الحدید، ۹ جولائی ۱۹۷۱ء

ہیں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

شعراوی جمعہ وزیر داخلہ ہونے کی حیثیت سے خفیہ پولیس کا سربراہ تھا۔ اُس نے اِس ادارے کو جس انداز میں استعمال کیا وہ ملاحظہ ہو۔ الجدید کا نامہ نگار مقیم قاہرہ لکھتا ہے:

"شعراوی جمعہ اپنے ہمعصروں میں تشدّد کا امام اور فیلسوف کہلاتا ہے۔ خفیہ پولیس نے آج تک تعذیب کے فن میں جو جدید ترین اختراعات کی ہیں یہ اُن سب سے نمایاں ہے بلکہ فنِ تعذیب میں کئی ایجادوں کا سہرا اس کے سر ہے۔ یہ نظریہ اسی نے ایجاد کیا ہے کہ اگر ملزم حسبِ منشا بیان دینے سے انکار کرے تو جیل کے اندر اُس کے سامنے اُس کی بیٹیوں اور بہنوں کو پولیس کے کتّوں کے آگے ڈالا جائے۔ یہ وہ ایجاد ہے جو نازیوں کے ذہن میں بھی نہ آسکی۔ نہ روسی کمیونسٹ اس کو سوچ سکے اور نہ اتحادیوں نے نشۂ فتح میں مست ہونے کے باوجود اسے اختیار کیا۔"[1]

۴۔ چوتھا بڑا ہتھیار پریس کا تھا۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلیویژن اور نشر و اشاعت کے دوسرے سائل سب اس کام پر مامور تھے کہ وہ حکومت اور بالخصوص ایک مخصوص گروپ کے حق میں پروپگنڈے کا ہنگامہ بلند کیے رکھیں۔ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ علی صبری اور شعراوی جمعہ کی خفیہ تنظیم نے پریس کے لوگوں میں بھی اپنے ایجنٹ پھیلا رکھے تھے جو عبدالناصر کے زمانے میں عبدالناصر کی شخصیت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے اور اس کے بعد علی صبری اور اس کے حامیوں کے نقیب بن گئے۔

اخبارات کو جب قومی ملکیت میں لے لیا گیا تو ایک طرف حکومت کے ہاتھ میں پروپگنڈے کا نہایت مضبوط حربہ آگیا اور مخالفانہ آواز اٹھنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی دوسری طرف سیاسی پارٹیاں میدان میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہر اخبار سیاسی پارٹی کا کردار انجام دینے لگا۔ اس سلسلہ میں ایک عرب صحافی زہیر مارونی نے بڑی دلچسپ معلومات بیان کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"مصری صحافت کے قومی تحویل میں چلے جانے کے بعد اخبارات مختلف طالع آزما گروپ کا اکھاڑہ بن گئے۔ کیونکہ ان کی نیشنلائزیشن جس طریقہ پر ہوئی تھی اس سے حکومت کی کمزوری کھل گئی۔ ناصر ازم کے نام سے جو بھانت بھانت کے سیاسی افکار و نظریاتی مذاہب

---

[1] الجدید ۲۸ جولائی ۱۹۷۱ء — [2] الجدید ۹ جولائی ۱۹۷۱ء

پل رہے تھے وہ اب اخبارات کے ذریعہ نمایاں ہو گئے ۔ روایاتی طاقتیں، یعنی سیاسی پارٹیاں، پیشہ ورانہ تنظیمیں اور تعلیمی و فکری ادارے اگر میدان میں نہ ہوں جن کی بدولت عوام کی آرزوؤں اور اُمنگوں اور ان کے تصورات و مطالبات کی نمائندگی اور ترقی ہوتی رہے تو سرکاری اخبارات ہی پارٹیوں کی جگہ لے لیتے ہیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر کے اظہار کا پلیٹ فارم بن جاتے ہیں ۔ عبدالناصر نے یہ سمجھا تھا کہ اخبارات کو اگر سرکاری تحویل میں لے لیا گیا تو اس طرح وہ صرف ایک ہی پارٹی یعنی سوشلسٹ یونین کے تابع رہیں گے ۔ لیکن خود سوشلسٹ یونین اندھیر گردی کا شکار تھی ۔ عوام کے بنیادی مسائل سے مُنہ موڑ چکی تھی ۔ اور مکروفریب کے کاروبار میں مبتلا ہو چکی تھی ۔ اس کا کام صرف اپنے مخصوص مفادات سمیٹنا اور مختلف طالع آزما گروپوں کی حمایت کرنا تھا ۔ دوسرے لفظوں میں وہ ان عناصر کی اسیر ہو گئی تھی جو اسے قائم کرنے والے تھے ۔ اور یہ وہ عناصر تھے جو اپنی ذات کے سوا کسی قانون اور قوت کو خاطر میں نہ لاتے تھے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مصری صحافت ایک نہایت خطرناک اور ظالمانہ ہتھیار کی شکل اختیار کر گئی "۔

"عبدالناصر نے مصری صحافت کا یہ خطرناک پہلو دیکھ کر اُسے براہِ راست سوشلسٹ یونین کی انتظامی کمیٹی کی نگرانی میں دے دیا ۔ روزنامہ الاخبار کا نگران انورالسادات کو بنایا گیا، روزنامہ الجمہوریہ علی صبری کو دے دیا گیا ۔ اور الاہرام کو خود عبدالناصر نے اپنے ہاتھ میں رکھ لیا ۔ اس کے نتیجہ میں صورتِ معاملہ یُوں تھی کہ انورالسادات اور علی صبری دو دھڑے مدِمقابل کھڑے ہو گئے جن کا توازن عبدالناصر کے ہاتھ میں تھا ۔ عبدالناصر کے بعد یہ دونوں دھڑے بھڑ گئے "۔[۱]

فاروق کا دور گو غنڈہ گردی سے خالی نہ تھا مگر سیاسی پارٹیاں موجود تھیں اور ان کی وجہ سے اخبارات بھی آزاد تھے ۔ جولائی ۱۹۵۲ء کے فوجی انقلاب کے بعد شروع شروع میں مصری صحافت نے حسبِ معمول آزادی اور جرأت کا رویہ اختیار کیا ۔ لیکن بعد میں اُس پر، ۱۸ سال تک کیا گزری، یہ ایک مصری صحافی ہی کی زبان سے سُنیے :

---

[۱] الجدید ۱۱ر جون ۱۹۷۱ء

"۴ مئی ۱۹۵۴ء کو مصر کی کونسل آف جرنلسٹ یونین کی طرف سے ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا جس میں کونسل نے پوری شدت کے ساتھ اُن مظالم کی مذمت کی جو مصری حکام کے ایک گروہ کی طرف سے مصری عوام پر کیے جا رہے تھے۔ کونسل نے اپنے ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی بھی بنائی تاکہ عالمی صحافت کے ساتھ ربط قائم کرے اور ان خونریز واقعات کو رکوائے جو قرونِ وسطیٰ کے مظالم سے بھی فوقیت لے گئے ہیں۔ اس تاریخی بیان پر جن صحافیوں نے دستخط کیے ان میں کونسل کے چیئرمین حسین ابوالفتح روزنامہ المصری کے چیف ایڈیٹر، اور مصطفیٰ القشاشی اخبار المصری کے اسسٹنٹ ایڈیٹر، فکری اباظہ، محمود العزب موسیٰ اور محمد عبدالرحیم رخا تھے۔"

"یہ بیان اُس وقت کے تمام مصری اخبارات نے چھاپا۔ سوائے روزنامہ الجمہوریہ کے جس کا نگران میجر صلاح سالم تھا۔ چنانچہ اس بیان کے بعد ۲۳ جولائی کی انقلابی تحریک اور مصری صحافت کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ روزالیوسف کے ایڈیٹر احسان عبدالقدوس نے ایک بھرپور مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: "ایک مسلح جتھہ مصر پر حکومت کر رہا ہے"۔ روزالیوسف کے چیف ایڈیٹر احمد بہاء الدین نے بھی ایک مضمون لکھا اور اس کا عنوان رکھا: "خفیہ فوجی تنظیم کب اپنے چہرے سے پردہ اٹھائے گی"۔ المصری کے چیف ایڈیٹر حسین ابوالفتح نے بھی ایسا ہی ایک تند و تیز مقالہ رقم کیا جس کا عنوان تھا: "دستور کہاں ہے؟" الجمہور المصری کے مالک و ایڈیٹر ابوالخیر نجیب نے اپنے اخبار میں یہ اداریہ لکھا کہ: "اپنی بیرکوں میں پلٹ جائیے"۔ استاذ فکری اباظہ نے اس جنگ میں زیادہ سخت رویّہ اختیار کیا اور اس فوجی گروہ پر شدید تنقید کی، جو دستور و قانون کے بغیر مصر پر حکومت کر رہا تھا۔"

"ملٹری پولیس احسان عبدالقدوس کے دفتر میں یکایک داخل ہوئی اور اُسے گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر لے گئی۔ احمد بہاء الدین کو اس وقت پکڑ لیا گیا جب وہ دفتر آ رہا تھا۔ ابوالخیر نجیب کے گھر پر چھاپہ مار کر اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ کونسل آف جرنلسٹ یونین کے چیئرمین حسین ابوالفتح کو کونسل کے دفتر میں گرفتار کیا گیا۔ فکری اباظہ بھاگ گیا۔ یہ قصہ ۶ مئی ۱۹۵۴ء کو پیش آیا۔"

"اس کے بعد مصر پر کئی سال ایسے گزرے جن میں پرانے قلم چھپ گئے اور نئے قلم ظہور پذیر ہو گئے لیکن تاریخ کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ بیشتر اہل قلم ایسے تھے جنہوں نے تشدد و جبر اور طمع و ترغیب کے باوجود اپنا ضمیر فروخت نہیں کیا۔ انہوں نے جیل کو قلم فروشی پر ترجیح دی۔ بعض اہل قلم گوشہ نشین ہو گئے"۔

"احسان عبدالقدوس نے تین ماہ جیل میں بسر کیے۔ اس دوران اس سے کسی شخص کو ملاقات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی ماں فوجی افسروں کے گھروں کا طواف کرتی، روتی اور آہیں بھرتی، مگر کوئی اسے جواب نہ دیتا۔ مختلف جیلوں کے دروازوں پر جاتی تاکہ معلوم کرے کہ اس کا بیٹا کس جیل میں ہے لیکن کسی نے اس کی طرف امداد کا ہاتھ نہ بڑھایا۔ ایک روز وہ فوجی جیل کے دروازے کے باہر سو رہی تھی۔ میجر صلاح سالم نے اچانک اسے دیکھ لیا اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسے گھر لے آیا اور احسان عبدالقدوس کو معافی دے دی گئی۔ وہ جیل سے سیدھا روز الیوسف کے دفتر آ گیا اور قلم فروشی کو اس نے اپنا پیشہ بنا لیا۔ آخر کار اسے اخبار الیوم کا رئیس التحریر بنا دیا گیا۔ احمد بہاء الدین نے چند روز جیل میں گزارے اور اپنی انٹلکچوئل نوازی کی وجہ سے جلد ہی رہا ہو گیا۔ اب وہ آزادی کا محافظ ہونے کے بجائے صبح و شام "آزادی" کو رگیدتا تھا۔ جن لوگوں کی کل تک تعریف کرتا تھا اب ان کے خلاف سی آئی ڈی کو رپورٹیں دینے لگا۔ احمد بہاء الدین کو اس قربانی کی جو قیمت دی گئی وہ یہ تھی کہ پہلے وہ ۱۶ پونڈ ماہانہ کماتا تھا اور بعد میں اس کی ماہانہ آمدنی ایک ہزار چھ سو پچاس پونڈ ہو گئی۔ الجمہور المصری کا ایڈیٹر ابوالخیر نجیب ۱۳ سال تک جیل میں رہا۔ ۸ سال تک اسے اپنے کسی عزیز سے جیل میں ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی۔ فکری اباظہ نے بھی خوشامد کا راستہ اختیار کر لیا اور حکومت کی خدمت کو اپنا وطیرہ بنا لیا"۔

"اس روز سے مصری اخبارات نے اپنا اصل انسانی فریضہ ترک کر دیا اور نیا فریضہ اختیار کر لیا یعنی حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنا، آزاد اور شریف انسانوں کی شہرت کو بٹہ لگانا اور ان پر کیچڑ اچھالنا اور حکومت کے گن گانا"۔[1]

---

[1] الحدید ۱۸ جون ۱۹۷۱ء مضمون محمد صادق۔

ناصر کے دورِ طویل میں پریس کی جملہ اصناف مصری نظام کی مدح سرائی کے لیے وقف رہیں ملک کے اندر بھی پریس نے یہی خدمات سرانجام دیں اور ملک کے باہر بھی مختلف اخبارات اس غرض کے لیے خرید لیے گئے ۔ الحدید کے نامہ نگار زہیر ماردینی مقیم قاہرہ نے انکشاف کیا ہے کہ ناصر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بیرونی ممالک میں پروپگنڈہ کے لیے ۲۰ کروڑ مصری پاؤنڈ کی رقم مخصوص کر رکھی تھی اس رقم کو اب انور السادات نے منجمد کر دیا ہے[1]۔"

علی صبری اور اس کے مضبوط گروپ نے مذکورہ بالا وسائل کے ذریعہ سے مصر کے اندر جو خوفناک فضا پیدا کر رکھی تھی اُس کا کچھ اندازہ سابقہ بیانات سے ہو جاتا ہے لیکن چند ایک بیانات مزید ملاحظہ ہوں:۔

مصر کے نامور روزنامہ الاخبار کے ایڈیٹر موسیٰ صبری نے اپنے تازہ ترین اداریہ میں لکھا ہے کہ باش کے جو پتے آج تک مصر کے اندر اپنا گھناؤنا کھیل رچاتے رہے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے مصر کی سیاسی زندگی سے رخصت ہو گئے ہیں اور مصری عوام کو خوف وہراس کی فضا سے نجات مل گئی ہے ۔ الاخبار ہی میں مصر کے ممتاز صحافی عبدالرحمٰن شرقاوی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے ۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"گزشتہ عہد میں مصری معاشرے پر اجنبی اور غیر مانوس اقدار کی حکمرانی رہی ہے ۔ اس عہد میں بھلائی اور شرافت بیوقوفی شمار ہوتی تھی اور راست روی اور فضیلت کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا ۔ اس دورِ تاریک میں کوئی شخص اگر اپنے لیے کوئی جگہ حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ طاقت اور نفوذ کے دھڑوں میں سے کسی دھڑے کی پناہ حاصل کرے ، گمراہ کُن پروپیگنڈے کو شعار بنالے ، ظلم و ستم میں مدد دے ، جھوٹ کا کاروبار چلائے ، اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی جاسوسی کرے اور اپنے سینے میں انسانی دل کے بجائے پتھر کا سیاہ ٹکڑا رکھے ۔"

"اگر کبھی کوئی آواز انقلابی حکومت کے اقدامات کی تصحیح کے مطالبہ میں اُٹھتی تھی یا کوئی شخص سوشلزم کے نام پر کی جانے والی دھاندلیوں کو بند کرنے کا مشورہ دیتا تھا تو اُسے درندوں کے آگے ڈال دیا جاتا تھا یا اُس پر شکاری کُتے چھوڑے جاتے ۔ اگر وہ پھر بھی اپنے خیالات سے باز نہ آتا تو اس کے پیٹے ٹکٹیاں نصب کر دی جاتیں اور اُسے اس الزام میں

---

[1] الحدید ۹ جولائی ۱۹۷۱ء

قید خانے میں پھینک دیا جاتا کہ یہ شخص سوشلزم کا مخالف اور انقلاب کا دشمن ہے"۔

"اب ہمارے لیے خاموشی مناسب نہیں ہے کیونکہ ہم اس وقت تاریکی کی طاقتوں غیر ملکی حملہ آوروں اور داخلی دشمنوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ غیر ملکی طاقتوں نے سرزمین مصر کے ایک نہایت قیمتی حصہ پر قبضہ کر رکھا ہے جس کو آزاد کرانا ناگزیر ہے لیکن داخلی حملہ آوروں کا کابوس ہماری چھاتیوں پر سوار رہا ہے اور اس نے اپنے تاریک سائے پورے ملک پر پھیلائے رکھے ہیں۔ اس داخلی سامراج کے اثرات سے بھی ملک کو کلیتہً پاک کرنا ہو گا"۔

"یہ ملکی قزاقوں کا گروہ جسے عوام نے اب اٹھا کر پھینک دیا ہے۔ انقلاب کی مخالفت سوشلزم کی حمایت اور ناصرازم کی علمبرداری کے پردوں میں حکومت کے اندر گھس آیا تھا۔ یہ گروہ ملیشیا کے ذریعہ اور خوفناک جاسوسی نظام کے بل پر اور قید خانوں کی طاقت سے حکمرانی کرتا رہا ہے۔ اس گروہ نے عوام الناس کو کچلنے اور خوف زدہ رکھنے کے لیے نازیوں سے بھی زیادہ شرمناک طریقے اختیار کر رکھے تھے"[1]۔

روزنامہ الجمہوریہ (جو علی صبری کے زیرِ نگرانی نکلتا رہا ہے) نے لکھا ہے کہ انورالسادات نے جن لوگوں کو گرفتار کیا ہے وہ عوام کے دشمن تھے۔ قاہرہ کے ایک اور انگریزی روزنامہ "ایجپشن گزٹ" نے لکھا ہے کہ یہ پورا گروہ انسانوں کا نہیں درندوں اور وحشیوں کا گروہ تھا۔ ایک دوسرا صحافی لکھتا ہے:

"عبدالناصر کے دور میں جب ہم گھروں سے نکلتے تھے تو ہمیں اس بات کا یقین نہ ہوتا تھا کہ ہم گھر واپس جا سکیں گے"[2]۔

یہ بیان خود مصری صحافیوں کے ہیں۔ ۱۷ سال تک بیرونی دنیا مصر کے ان مظالم کے خلاف واویلا کرتی رہی ہے۔ مگر اب خود گھر کے بھیدی ان رازوں سے پردہ اٹھا رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

---

[1] روزنامہ الاخبار، قاہرہ شمارہ ۱۸ مئی ۱۹۷۱ء [2] بحوالہ الجدید ۹ جولائی ۱۹۷۱ء

مطبوعات

اقبال اور احیائے دین | تالیف جناب خالد علوی صاحب، استاذ شعبۂ علومِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور
ناشر: المکتبۃ العلمیہ لیک روڈ، لاہور۔ صفحات ۹۲ قیمت ۲ روپے ۱۰ پیسے۔

تجدید و احیائے دین کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح کسی دین و مذہب کے افسردہ چراغ کو اس طرح پھر سے روشن کیا جائے کہ اُس کی لو میں بھی کوئی فرق نہ آنے پائے اور اس سے عہدِ حاضر کے در و دیوار اس انداز سے تابندہ کیے جائیں کہ دیکھنے والی آنکھ یہ نہ کہہ سکے کہ یہ کسی ٹمٹماتے چراغ کے سائے ہیں۔ تجدید و احیائے دین کی طویل تاریخ اس حقیقت کی شہادت پیش کرتی ہے کہ جن حضرات نے اس میدان میں کام کیا ہے اُن میں سے ایک اچھی خاصی تعداد خلوص نیت کے باوجود اس فرض کو کما حقہٗ انجام نہیں دے سکی۔ اس میں سے ایک طبقے نے تجدّد اور تجدید میں جو واضح امتیاز ہے، اُسے نظر انداز کیا اور دین کو وقت کے غالب تہذیبی رجحانات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس غلط طرزِ فکر نے بالآخر الحاد کے لیے راستہ ہموار کیا۔ دوسرے طبقے نے وقت کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے احیائے دین کے لیے جدوجہد کی۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ نئے افکار و نظریات سے متاثر لوگوں کی عظیم اکثریت کو اس جہاد میں اپنے ساتھ شامل کرنے میں ناکام رہے۔

علامہ محمد اقبال ان معدودے چند خوش نصیب مفکرین میں سے ہیں جنہوں نے ایک طرف تو اسلامی تعلیمات کو بغیر کسی تاویل و تعبیر کے اُسی طرح قبول کیا جس طرح کہ انہیں شارع علیہ السلام نے پیش فرمایا تھا اور دوسری طرف عہدِ حاضر کے تہذیبی رجحانات کی فکری لغزشوں کی بڑے عالمانہ انداز میں نشاندہی کر کے ان کے طلسم کو توڑا اور مسلمانوں خصوصاً ان کی نوخیز نسلوں کے ذہنوں میں مغربی افکار کے بارے میں جو مرعوبیت پائی جاتی تھی، اُسے ختم کر کے اُن کے اندر اسلام کے بارے میں اعتماد اور ایقان پیدا کیا۔

پروفیسر خالد علوی نے علامہ مرحوم کی اس مساعی کا نہایت اچھے انداز میں جائزہ لیا ہے اور علامہ

اقبال مرحوم کی تعلیمات کی روشنی میں احیائے دین کے خطوط متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر بڑی جاندار اور فکر انگیز ہے اور مصنف کے وسعت مطالعہ، اقبال فہمی اور خلوص کی ہر لحاظ سے آئینہ دار ہے۔ کتاب کا پیش لفظ نامور ادیب اور مفکر ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے لکھا ہے۔

کتاب نہایت سلیقے سے عمدہ ٹائپ پر شائع کی گئی ہے۔

الکحل (بزبان انگریزی) سائنس اور اسلام تالیف جناب ریاض الحسن صاحب نوری ایم۔ اے۔ شائع کردہ دار الفکر، اچھرہ لاہور۔ قیمت پچاس پیسے۔ صفحات ۲۴۔

دار الفکر نے اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لیے جو قیمتی کتابچے شائع کیے ہیں اُن میں یہ کتابچہ بڑا قابلِ قدر ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے خمر کی ضرر رسانیوں اور تباہ کاریوں کے متعلق نہایت مستند معلومات جمع کی ہیں۔ اس کا تعارف ملک کے معروف ڈاکٹر واسطی پروفیسر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور نے لکھا ہے۔

اسلامی نظامِ معیشت کے چند اصول تالیف مولانا نور محمد اعظمی صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ المعارف فرید آباد۔ ڈھاکہ ۴۔ قیمت ایک روپیہ۔ صفحات ۹۴۔

اس کتاب کے فاضل مصنف کسی تعارف کے محتاج نہیں، اُن کی عمر کا بیشتر حصہ دینی مدارس میں تفسیر و حدیث پڑھانے میں گزرا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشکوٰۃ المصابیح پڑھاتے ہوئے جب وہ کتاب الزکوٰۃ پر پہنچے تو انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اس حصّے کو جدید معاشی مسائل کی روشنی میں شرح و بسط سے مرتب کر دیں۔ زیر تبصرہ کتاب اُن کے اس مقدس ارادے کی تکمیل ہے۔ یہ کتاب پہلے بنگلہ میں لکھی گئی، پھر اس کا ترجمہ کر کے اُسے ماہنامہ البلاغ کراچی میں شائع کروایا گیا اور اب مصنف کی نظرثانی کے بعد اسے ادارہ المعارف ڈھاکہ نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

کتاب مختصر ہونے کے باوجود علمی اعتبار سے بڑی وقیع ہے۔ معیار طباعت و کتابت عمدہ ہے۔

(بقیہ اشارات)

چیز اشتراکی معاشرے کے لیے سمِ قاتل ہے۔ عوام کو اشتراکیت کا صحیح معنوں میں پرستار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زندگی کے صرف ایک شعبے ہی میں اشتراکیت کی برتری قائم نہ کی جائے بلکہ فکر و نظر کے جس قدر گوشے اور عمل کے جس قدر میدان ممکن ہوسکتے ہیں ان سب میں اشتراکیت کی بالادستی قائم کرنے کے لیے کوشش کی جائے تاکہ حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہ رہے جو اشتراکیت کا ترجمان نہ ہو۔ اس کے لیے نظامِ تعلیم اور نشر و اشاعت کے ذرائع کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

فاضل مصنف کے نزدیک اشتراکیت کو مسلمانوں میں ایک مؤثر قوت بنانے کے لیے دوسری اہم تدبیر یہ ہے کہ ان کے خاندانی نظام اور ازدواجی زندگی کو اس انداز سے درہم برہم کر دیا جائے کہ اسلام کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ انہیں مسلمان عورت کے اس طرزِ فکر سے خاص طور پر شکایت ہے کہ وہ کوشش کے باوجود ابھی تک شمعِ انجمن بننے سے گریز کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے یہ الفاظ بڑی توجہ کے محتاج ہیں:

"مذہبی اقدار کے بقا اور اُن کی ترقی کا ایک بڑا سبب عورتوں کا مردوں سے الگ تھلگ رہنے کا رجحان ہے۔ یہ رجحان اس حقیقت کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ پرانے خاندانی نظام کے کچھ عناصر ابھی موجود ہیں۔" (ص ۳۲)

اس تذکرے کے بعد وہ اشتراکیت کے علمبرداروں کو اُن کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہمیں عورتوں کو غیر مذہبی تربیت دینے کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے اور اس کام کو ان کی خاندانی حیثیت، عمر، تعلیم، قومی روایات اور رواج کو ملحوظِ خاطر رکھ کر سرانجام دینا چاہیے۔ عورتوں میں دل لگا کر کام کیجیے، ان کے اندر جاگیرداری نظام کے جتنے نقوش پائے جاتے ہیں انہیں مٹانے کے لیے جدوجہد کیجیے اور ان کی جگہ نئے طور طریقوں کا پرچار کیجیے۔"

مسلم معاشرے میں اشتراکیت کی سربلندی کے لیے تیسری اہم تدبیر جس کی طرف مسٹر لشانوو نے اشارہ کیا ہے وہ علمی اور تحقیقی کام کے لیے نئے موضوعات کی تلاش ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ اشتراکی اہلِ علم مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو زیرِ بحث لانے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اُن تمام موضوعات پر غور و فکر کرنے کی کوشش کریں جو مسلمانوں کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر انہیں یہ بتائیں کہ ان کی سماجی زندگی توہم پرستی کا نمونہ ہے جس کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔

فون نمبر: ۵۲۵۰۷ رجسٹرڈ ایل نمبر ۱ ۵۳۴۰

مفکرِ اسلام مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کی معرکۃ الآرا تفسیر

تفہیم القرآن

پانچویں (۵) جلد

- ہر سورۃ کے شروع میں فاضلانہ تعارفی تمہید،
- اصطلاحات کی فکر انگیز توضیح،
- اہم تمدنی مسائل پر حکیمانہ بحث،
- تفسیری اختلافات کا عالمانہ محاکمہ،
- سائنٹیفک طرزِ بیان،
- جلد کے آخر میں موضوعات کا جامع اشاریہ،

اعلیٰ کتابت • دلکش طباعت • سفید کاغذ • خوب صورت جلد

ہدیہ چھبیس (۲۶) روپے بمعہ ڈاک خرچ

کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے پہلا ایڈیشن قلیل تعداد میں چھپ رہا ہے

آپ اپنے آرڈر جلد از جلد بک کرالیں تاکہ آپ کو دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے

ادارہ ترجمان القرآن، ۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ۔ لاہور

نوٹ ایجنٹ حضرات براہ راست ادارہ سے خط و کتابت کریں